محض شبہ کی بنا پر وضو نہیں ٹوٹتا

وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا وَجَدَ اَحَدُكُمْ فِىْ بَطْنِهٖ شَيْئًا فَاَشْكَلَ عَلَيْهِ اَخَرَجَ مِنْهُ شَیْءٌ اَمْ لَا فَلَا يَخْرُجَنَّ مِنَ الْمَسْجِدِ حَتّٰى يَسْمَعَ صَوْتًا اَوْ يَجِدَ رِيْحًا. [رواہ مسلم]

''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تم میں سے کوئی اپنے پیٹ میں کچھ محسوس کرے۔ اور اسے شبہ ہو کہ پیٹ سے کچھ نکلا ہے یا نہیں (وہ محض شبہ کی بنا پر) مسجد سے نہ نکلے۔ جب تک وہ آواز نہ سنے یا اسے بدبو نہ آئے۔''

دین کے بنیادی اصول ۴۰

اصول نمبر 40:...... وَمَنْ لَقِيَ اللّٰهَ بِذَنْبٍ يَجِبُ لَهُ بِهِ النَّارَ ، تَائِبًا غَيْرَ مُصِرٍّ عَلَيْهِ ـ فَإِنَّ اللّٰهَ يَتُوبُ عَلَيْهِ، وَيَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهِ وَيَعْفُوَ عَنِ السَّيِّئَاتِ ـ

''جو شخص اللہ تعالیٰ کو ایسا گناہ لے کر ملے کہ اس سے گناہ گار پر آگ واجب ہو، لیکن وہ توبہ کرنے والا ہو اور گناہ پر ہمیشہ قائم رہنے والا نہ ہو تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول فرمالیں گے۔ اللہ تعالیٰ بندوں سے ان کی توبہ قبول کرتے ہیں اوران کے گناہوں کو معاف بھی کرتے ہیں۔'' دلائل: فرمان باری تعالی ہے:

1: ﴿وَهُوَ الَّذِيْ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهِ وَيَعْفُوْا عَنِ السَّيِّئَاتِ﴾ [الشوری: ۲۵]

''اللہ تعالیٰ ہی وہ ہستی ہے جو اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے۔''

2: ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے مغرب سے سورج طلوع ہونے سے پہلے توبہ کر لی اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول فرمالیں گے۔'' [مسلم: ۲۷۰۳]

3: عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما راوی ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ بندے سے توبہ قبول فرماتے رہتے ہیں جب تک وہ غرغرے (جان کنی کی کیفیت) تک نہ پہنچ جائے۔''

[سنن ترمذی: ۳۵۳۷ـ سنن ابن ماجه: ۴۲۵۳ ـ مسند احمد: ۱۳۲/۲]

اصول نمبر 41:...... وَمَنْ لَقِيَهُ وَقَدْ أُقِيْمَ عَلَيْهِ حَدُّ ذَالِكَ الذَّنْبِ فِي الدُّنْيَا فَهُوَ كَفَّارَتُهُ، كَمَا جَاءَ فِي الْخَبَرِ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ ـ

''جو اللہ تعالیٰ سے اس حال میں ملے کہ کسی گناہ کی حد اس پر دنیا میں ہی قائم ہو چکی ہو، تو یہ اس کے لیے کفارہ ہوگی، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث میں منقول ہے۔''

خزیمہ بن ثابت رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے کوئی گناہ کیا پھر اسے اس گناہ کی پاداش میں حد لگائی گئی تو یہ اس کا کفارہ ہوگی۔'' [مسند احمد جلد ۵ ص: ۲۱۵، حافظ ابن حجر نے (فتح الباری: ۸۶/۱)]

عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اے لوگو! مجھ سے ان باتوں پر بیعت کرو: اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو گے، چوری نہ کرو گے، بدکاری نہ کرو گے،...... جس نے ان باتوں کو پورا کیا اس کا اجر اللہ تعالیٰ کے ذمے ہے، اور جس نے ان میں سے کسی کا ارتکاب کیا اور اسے دنیا میں ہی سزا دی گئی تو یہ اس کا کفارہ ہوگی، اور جس نے جرم کیا لیکن اللہ تعالیٰ نے اس پر پردہ ڈال دیا تو اس کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے چاہے تو اسے سزا دے چاہے تو معاف کر دے۔'' [صحیح بخاری: ۳۸۹۲ـ صحیح مسلم: ۷۰۹]

فہرست

وقت کی ضرورت

اداریہ ——— حافظ احمد شاکر

ہر مسلمان، ہر خطیب، ہر لیڈر حتی کہ بعض حاکم بھی بڑی آن بان اور شان سے یہ کہتے، دعویٰ کرتے اور نعرے لگاتے ہیں کہ نبی ﷺ کی حیات مبارکہ قیامت تک کے لیے اسوۂ حسنہ یعنی زندگی بھر کا لائحہ عمل ہے۔ لیکن افسوس کہ سب نے بلاتمیز اور حسب منصب و ذمہ داری کبھی اس کی حقیقت پر غور نہیں کیا کہ اسوۂ حسنہ کیا ہے اور اس کے لیے راہ نمائی کہاں سے مل سکتی ہے یا کہاں سے لینی چاہیے۔

صدق وصفا اور وفاء وحیاء تو آپ ﷺ کی ایسی صفات حسنہ ہیں جن سے آپ عطائے نبوت سے پہلے ہی مالا مال تھے۔ نبوت نے آپ کو عقیدہ توحید سے سرفراز ہی نہیں کیا بلکہ ''قم فانذر'' [المدثر] فرما کر آپ کو دنیائے انسانیت تک اس دعوت توحید پہنچانے کا ذمہ دار بھی بنا دیا۔ علمائے امت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ آپ کی مکی زندگی تعلیم وتربیت کی تھی۔ جس کی وضاحت کی جائے تو بات یہ کہی جاسکتی ہے کہ مکی زندگی میں آپ نے ایمان کی دعوت دی اور دعوت کے راستے میں تمام مصائب ومشکلات کو نہ صرف آپ نے بلکہ ایمان کی سعادت سے بہرہ ور ہونے والے آپ کے جاں نثاروں بھی برداشت کیا اور اس عقیدے یعنی نظریے پر عمل پیرا بھی ہوئے، اس کی حفاظت بھی کی اس کے لیے ایثار بھی کیا اور مالی، جانی اور خاندانی قربانیاں بھی دیں۔ محاوراتی زبان میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ عقیدے کے اس پودے کو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے جگر کا خون دے کر ۱۳ سال تک پالا پوسا اور بڑھایا پھیلایا اور اس کا دفاع بھی کیا۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی مشیت نے جب چاہا لیکن بہ ظاہر اللہ تعالیٰ کے علم میں جب چندسو مسلمانوں کا عقیدہ مضبوط ہوگیا، اور مسلمان اس عقیدے کی بنیاد پر ایک نظام تشکیل دینے کے اہل ہوگئے تو پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی محمد ﷺ کو ہجرت کا حکم دیا تاکہ وہ جس عقیدے کی دعوت دیتے رہے اس پر عمل کرتے رہے اب وہ مدینہ منورہ جائیں اور دنیا کو ایک ایسا نظام قائم کرکے دکھائیں جس میں کھلے عام دعوت توحید بھی ہو، نظام عمل بھی ہو، عدل بھی ہو، معاشی پالیسی بھی ہو اور اقتصاد کا طریق کار بھی۔ اخوت وبھائی چارہ بھی ہو اور کفار سے معاہدے اور میثاق بھی۔

ہمارے سیاست دان خصوصاً وہ لوگ جو پاکستان کی وجہ قیام نظریہ پاکستان کو قرار دیتے ہیں اور نظریہ پاکستان کو اسلام کا ہم معنی جانتے ہوئے قیام پاکستان کی وجہ اسلام قرار دیتے ہیں ان سے ہم عرض کرنا چاہتے ہیں کہ وہ نبی ﷺ کی حیاتِ مبارکہ کو اپنے رفقاء سمیت اگر واقعہ اسوۂ حسنہ سمجھتے ہیں تو کیا وطن عزیز کے وجود میں آنے کے بعد اس کے نظریے یعنی عقیدے لا الٰہ الا اللہ کی...... غیر مسلموں تک...... دعوت پھیلائی؟ اس عقیدے یا نظریے کا تحفظ کیا؟ اس پر عمل کیا؟ اس کے نظام کو قلب صمیم کے ساتھ...... اگر بالفرض تسلیم بھی کرلیا ہو تو...... اس کے نفاذ کی طرف عملاً کوئی قدم اٹھایا؟ اس کے ظاہری...... غیر اسلامی ممالک...... دشمنوں سے اظہار نفرت یا کم از کم کبھی پہلو تہی کی؟ اس کے باطنی...... مدینہ منورہ کے منافقوں جیسے...... دشمنوں پر کبھی ضرب لگائی یا ان کو کبھی آشکار کیا؟ ۱۹۴۷ء کا نظام عدل کا گراف اوپر گیا یا نیچے آیا؟ حکم رانوں، سیاست دانوں، سرکاری کارندوں کی رفتار عمل کیا رہی اور ان کا ہدف کیا رہا؟ اور معاشرے کی اخلاقی سطح بلند ہوئی یا پست؟ دیانت وامانت کا معیار ترقی پذیر رہا یا روبہ تنزل؟

یہ بات تاریخ کا حصہ بن چکی ہے اور اس سے انکار ممکن ہی نہیں کہ بانی پاکستان کی وفات کے بعد ہمارے حکم رانوں نے جب قرآنِ حکیم کے

ان صریح احکام:

اے ایمان والو! تم اپنے اور میرے دشمنوں کو دوست مت بناؤ۔''[الممتحنة]

''اے ایمان والو! تم یہود ونصاریٰ کو دوست مت بناؤ۔''[المائدة]

''اے مسلمانو! تم اپنے سوا کسی کو رازدار مت بناؤ۔''[آلِ عمران]

کی خلاف ورزی شروع کردی اور اپنی معاشی وسیاسی باگ ڈور غیروں کے ہاتھ میں دے دی تو پھر اغیار نے ہمیں قرض کی لت میں ڈال کر کانا کرلیا اور دخل اندازی اس طرح شروع کردی کہ اب ''اپنے'' اور ''ان کے'' فیصلوں کی نسبت خطرناک حد تک تلپٹ ہوچکی ہے اور افسوس ناک بات یہ ہے کہ من حیث القوم ہم......حاکموں، سیاست دانوں اور منتظموں (Burro crates)......احساس زیاں سے عاری ہوچکے ہیں۔ اس لیے بقول اقبالؒ

وائے ناکامی متاع کارواں جاتا رہا　　کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

ان اغیار نے بڑی گہری سوچ اور سازش سے اسوۂ حسنہ سے نسبتاً زیادہ باخبر طبقے......یعنی علمائے دین......کو وطن کے نظام وانصرام سے حتی الامکان دور رکھا ہاں صرف مولانا شبیر احمد عثمانی پر بانی پاکستان نے اعتماد کیا اور انہوں نے اس وقت دین اسلام کی حتی الامکان خدمات سرانجام دیں حتی کہ صرف ایک......یعنی تنہا......ہوکر بھی ۳۱ علماء سے نفاذ اسلام کے لیے ۲۲ متفق علیہ نکات منظور کروا کر پیش کردیے لیکن حکومت کے کرتا دھرتا چوں کہ یہ......یعنی اسلام......چاہتے ہی نہیں تھے اس لیے ان سفارشات کو بھی کھڈے لائن لگا دیا اور ایسی حفاظتی تدابیر اختیار کرلی گئیں کہ آئندہ سے یہ خرقہ پوش حکومتی انتظام وانصرام کے قریب نہ پھٹک سکیں۔ اگرچہ دوسرا پہلو یہ بھی ہے کہ علماء نے جدید نظامہائے حکومت خصوصاً معاشیات واقتصادیات کی طرف اپنی حسب ذمہ داری توجہ بھی نہیں کی۔ تاہم حکومتی حلقوں میں دینی ذہن رکھنے والے افراد......جنہیں مونا یعنی کلین شیو مولوی بھی کہہ لیں......نے وطن عزیز کے نصاب تعلیم میں دین کو ممکن حد تک شامل رکھا لیکن یار لوگوں نے نصاب میں سے دین کو دھیرے دھیرے اس طرح کم کردیا جس طرح بڑھئی کے ہاتھوں ایک کڑی کی ٹیڑھ نکلتے نکلتے وہ نابود ہی ہوگئی تھی یا کھلے لفظوں میں یہ کہہ لیں کہ جس طرح مشرف دور میں نصاب میں سے قرآن وحدیث کی تعلیمات کو نکال دیا گیا تھا۔

وہ طبقے اور حلقے......مدبر یعنی تھنک ٹینک، دانشور، لکھاری اور شوق حکمرانی سے محفوظ اور سیاست کا ادراک رکھنے والے......جو احساس زیاں کی محرومی سے آگاہ ہیں انہیں چاہیے کہ وہ موجودہ حالات کی اصلاح کی تجاویز اسوۂ حسنہ کی روشنی میں تحریر کریں ان کی تشریح یعنی نشان دہی کریں پھر ان کو شائع کریں اور ذرائع ابلاغ تک پہنچائیں اور قوم کی صحیح راہ نمائی کریں۔

اس سلسلہ میں ہماری طبقہ علماء سے بھی گزارش ہے کہ وہ بھی ۳۱ علماء کا ساجذبہ لے کر میدان میں آئیں اور اغیار کے پھیلائے باہمی فقہی ومسلکی اختلافات کی مسموم فضا کو ختم کرکے ملک کے استحکام، امت کے اتحاد اور دشمن کی پالیسی ''آپس میں لڑاؤ اور حکومت کرو'' کو ناکام بنانے کی خاطر انہیں نکات کو بنیاد بناتے ہوئے حکومت کو ایسا لائحہ عمل دیں جس سے اتمام حجت ہوجائے کہ اہل دین نے اپنی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہوکر اپنا فرض منصبی ادا کردیا ہے اور اللہ تعالیٰ کے حضور بھی سرخ رو ہوکر ثوابِ دارین حاصل کریں نیز عوام کو بھی اتفاق واتحاد اور ایثار وقربانی کی بادِ بہاری سے بہرہ ور کریں۔ اللہ کے لیے شیعہ وسنی، بریلوی دیوبندی، مقلد وغیر مقلد اور حنفی واہل حدیث کے مابین مناظروں، مباحثوں اور طعن وتشنیع چھوڑ کر نئی نسل کو اپنے عمل اور رویہ سے دین بتائیں، سمجھائیں اور عوام کو فروعی مسائل میں الجھانے کی بجائے عمل کی طرف راغب کریں، انہیں اسلام کے بارے میں اغیار کی سازشوں اور دسیسہ کاریوں سے آگاہ کریں۔ مسلم امہ کی حالت سے ان کو آگاہ کریں۔ سود، معاشیات واقتصادیات، اعضاء کی پیوندکاری اور جدید پیش آمدہ مسائل پر مطالعہ خود کریں اور عام مسلمانوں کی علمی راہ نمائی کریں۔ قوم کو اس وقت ان چیزوں کی ضرورت ہے۔ ان کی ہمت بندھائیں تاکہ ان کا جذبہ جوان اور مورال بلند ہو۔

درس قرآن | قسط نمبر ⑬

تفسیر سورۂ ق

مولانا ارشاد الحق اثری حفظہ اللہ

﴿اِذْ يَتَلَقَّى الْمُتَلَقِّيَانِ عَنِ الْيَمِيْنِ وَعَنِ الشِّمَالِ قَعِيْدٌ ○ مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ ○﴾ [ق: ۱۷،۱۸]

''(خیال رکھو) جب دو اخذ کرنے والے اخذ کرتے رہتے ہیں، ایک اس کے دائیں بیٹھا ہے اور دوسرا بائیں بیٹھا ہے۔ وہ کوئی لفظ بھی نہیں بولتا، مگر اس کے پاس مستعد نگران موجود ہوتا ہے۔''

یہ آیات پہلی آیت کا ہی تتمہ ہیں، کہ اللہ تعالیٰ انسان کی تمام حرکات وسکنات کو جانتے ہیں، کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ چیز بھی اس کے علم سے خارج نہیں، اس کے علاوہ اتمامِ حجت کے لیے اللہ تعالیٰ کے دو فرشتے بھی انسان پر نگران مقرر ہیں، انسان جو لفظ بولتا ہے وہ اس کو لکھ لیتے ہیں۔ اس کا بول ہی نہیں، بلکہ ہاتھ پاؤں سے کیے ہوئے تمام اعمال کو بھی وہ نوٹ کرتے ہیں۔ سورۃ الزخرف میں یہی بات یوں ہے:

﴿اَمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّا لَا نَسْمَعُ سِرَّهُمْ وَنَجْوٰىهُمْ بَلٰى وَرُسُلُنَا لَدَيْهِمْ يَكْتُبُوْنَ ○﴾ [الزخرف: ۸۰]

''کیا وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم ان کی راز کی باتیں اور ان کی سرگوشیاں سنتے نہیں؟ ہاں! ہم سب کچھ سنتے ہیں اور ہمارے فرشتے ان کے پاس لکھ رہے ہیں۔''

یہاں پہلی آیت نمبر سولہ (۱۶) میں اللہ تعالیٰ کے علم کا بیان ہے اور اس کے بعد کی آیات میں فرشتوں کے نوشتوں کا تذکرہ ہے۔

﴿اِذْ يَتَلَقَّى الْمُتَلَقِّيَانِ﴾ تلقّی کے معنی اخذ کرنے، لینے، حاصل کرنے کے ہیں۔ حضرت آدم علیہ السلام کے بارے میں ہے:

﴿فَتَلَقّٰى آدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ﴾ آدم علیہ السلام نے اپنے ربّ سے چند کلمات حاصل کرلیے۔ اور ﴿الْمُتَلَقِّيَانِ﴾ سے دو لینے اور اخذ کرنے والے فرشتے مراد ہیں، جو انسان کے دائیں بائیں رہتے ہیں۔ دائیں طرف کا فرشتہ انسان کے امورِ خیر کو قلم بند کرتا ہے جب کہ بائیں جانب کا فرشتہ انسان کے امورِ شر کو لکھتا ہے، اور ان فرشتوں کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ وہ ﴿قَعِيْدٌ﴾ ہیں۔

یہاں قَعِيْدٌ بمعنی قاعد کے ہے یعنی بیٹھے ہوئے۔ جیسے ''جلیس'' بمعنی ''جالس'' ہے۔ مگر فرق یہ ہے کہ ''قاعد'' اور ''جالس'' بیٹھنے والے کو کہتے ہیں، جب کہ جلیس اور قعید، ساتھی اور مصاحب کے مفہوم میں ہے۔ یعنی ہر آن ساتھ رہنے والے ہیں خواہ کوئی بیٹھا ہو، لیٹا ہو یا چلنے پھرنے والا ہو۔ یہ فرشتے بڑے معزز اور باحیا ہیں، جب انسان بول وبراز کے وقت یا جماع کی ضرورت کے پیشِ نظر اپنی شرم گاہ سے کپڑا اُٹھاتا ہے تو وہ اس سے علیحدہ ہوجاتے ہیں۔ [ترمذی: ۲۸۰۰۔ مجمع الزوائد، ص: ۲۹۳، ج: ٤۔ عبدالرزاق، ص: ۲۸۵، ج: ۱، رقم: ۱۱۰۱]

ان فرشتوں کے بارے میں فرمایا کہ وہ ﴿رَقِيْبٌ﴾ یعنی نگران مقرر ہیں۔ اس کی اصل ''رَقَبَةٌ'' ہے جس کے معنی گردن کے ہیں۔ نگران بھی اس کی گردن پر نظر رکھتا ہے جس کی نگرانی مقصود ہوتی ہے یا اس لیے کہ وہ نگرانی کے لیے بار بار گردن اٹھا کر دیکھتا ہے۔ ان نگرانوں کو انسان کی طرح کا نگران مت سمجھو، جو اپنی ذمہ داری پوری نہیں کرتا، غفلت وسستی اختیار کر جاتا ہے، مگر اللہ تعالیٰ کے نگران ایسے ہیں جو

﴿عَتِيۡدٌ﴾ بھی ہیں، ہرلحظہ موجود، حاضر، مستعد اور بروقت تیار رہتے ہیں، ذرّہ بھر اس میں کوتاہی نہیں کرتے، اور جو انہیں حکم دیا جائے نافرمانی نہیں کرتے۔

﴿ لَا يَعۡصُونَ اللّٰهَ مَاۤ اَمَرَهُمۡ وَيَفۡعَلُوۡنَ مَا يُؤۡمَرُوۡنَ ۝ ﴾ [التحریم: ٦]

فرشتوں کی اسی ذمہ داری کا ذکر ایک اور مقام پر یوں ہے:

﴿وَاِنَّ عَلَيۡكُمۡ لَحٰفِظِيۡنَ ۝ كِرَامًا كَاتِبِيۡنَ ۝ يَعۡلَمُوۡنَ مَا تَفۡعَلُوۡنَ ۝ ﴾ [الانفطار: ١٠-١٢]

''اور بے شک تم پر نگران مقرر ہیں، ایسے معزز کاتب ہیں جو تمہارے ہر فعل کو جانتے ہیں۔''

یعنی یہ فرشتے بڑے معزز و مکرم ہیں، اللہ تعالیٰ کے سچے اطاعت گزار ہیں، کسی پر کوئی زیادتی نہیں کرتے، نہ انہیں کسی سے ذاتی محبت ہے نہ ہی عداوت، جو کچھ وہ دیکھتے سنتے ہیں، بغیر کسی رو رعایت اور بغیر افراط و تفریط کے بالکل صحیح صحیح سب کچھ لکھ رہے ہیں، انھی کے یہ نوشتے جب قیامت کے روز مجرم دیکھیں گے تو افسوس سے اعتراف کریں گے کہ

﴿يٰوَيۡلَتَنَا مَالِ هٰذَا الۡكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيۡرَةً وَّ لَا كَبِيۡرَةً اِلَّاۤ اَحۡصٰهَا وَ وَجَدُوۡا مَا عَمِلُوۡا حَاضِرًا وَ لَا يَظۡلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا۝ ﴾ [الکھف: ٤٩]

''ہائے افسوس! یہ کیسی کتاب ہے، جس میں ہماری کوئی چھوٹی اور بڑی حرکت ایسی نہیں جو درج نہ ہو، جو کچھ انہوں نے کیا تھا وہ سب اپنے سامنے پائیں گے اور تیرا ربّ کسی پر ظلم نہیں کرتا۔''

یہی نامۂ اعمال قیامت کے دن کھلی کتاب کی طرح انسان کے سامنے ہوگا اور اسے کہا جائے گا:

﴿اِقۡرَاۡ كِتٰبَكَ كَفٰى بِنَفۡسِكَ الۡيَوۡمَ عَلَيۡكَ حَسِيۡبًا ۝ ﴾

''پڑھ اپنا نامۂ اعمال، آج تو اپنا حساب لگانے کے لیے خود ہی کافی ہے۔'' [الاسراء: ١٤]

اس بارے میں اختلاف ہے کہ کیا فرشتے ہر عمل اور ہر بول لکھتے ہیں یا وہی لکھتے ہیں جس میں خیر و شر کا اور ثواب و عقاب کا پہلو ہوتا ہے۔ قرآنِ مجید کے ظاہر سیاق سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ ہر قول و عمل لکھا جاتا ہے۔ [ابن کثیر]

یہی قول امام مجاہد، طاؤس، عطاء بن ابی رباح ؒ کا ہے۔ امام ربیع بن خثیم ؒ اس بارے اس قدر محتاط تھے کہ ایک بار ان کی بیٹی نے ان سے کھیلنے کی اجازت طلب کی، تو انہوں نے اجازت نہ دی۔ شاگردوں نے عرض کیا کہ آپ اجازت دے دیں، تو انہوں نے فرمایا: میں یہ پسند نہیں کرتا کہ میرے نامۂ اعمال میں یہ لکھا جائے کہ اِذْهَبِیْ فَالْعَبِیْ ''جاؤ کھیلو'' بلکہ میں تو یہی کہوں گا کہ جاؤ اچھی بات کہو اور اچھا عمل کرو۔ [ابن ابی شیبه، الثقات للعجلی، ص: ١٥٤]

امام احمد ؒ بیماری کی حالت میں کراہتے اور ہائے ہائے کرتے تھے، مگر جب انہیں پتا چلا کہ امام طاؤس ؒ نے فرمایا ہے کہ فرشتے مریض کے کراہنے کی آواز بھی لکھتے ہیں، تو انہوں نے پھر زندگی بھر ہائے ہائے نہیں کہی۔ [ابن کثیر]

امام طاؤس ؒ کے علاوہ یہی بات امام مجاہد ؒ نے بھی فرمائی ہے۔ [ابن ابی شیبه]

امام عطاء ؒ فرماتے ہیں کہ ہمارے اسلاف ہر اس کلام کو مکروہ سمجھتے تھے جو کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ کے علاوہ ہو، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے اس کا تعلق نہ ہو، یا جائز دنیوی فائدہ اس میں نہ ہو۔ [ابن ابی شیبه]

یہ زمانہ اور زندگی بڑی قیمتی ہے اسے فضول باتوں میں یا لایعنی مشاغل میں ضائع کرنا کوئی عقل مندی نہیں، لایعنی امور سے رسول اللہ ﷺ نے بہر حال روکا ہے، اس حکم کی نافرمانی پر اگر باز پرس ہو تو انسان کو اس بارے میں ابھی سے فیصلہ کرنا چاہیے کہ جواب کیا ہوگا، اور یہ بھی کہ یہ لایعنی امور مقصد زندگی تو بہر حال نہیں ہیں۔ قرآنِ مجید کے ظاہری سیاق سے تو معلوم ہوتا ہے کہ انسان کا ہر قول و عمل لکھا

جاتا ہے۔

انسان کے دل میں جو خطرات آتے ہیں انہیں فرشتے نہیں لکھتے، کیا وہ ان کی دسترس سے باہر ہیں یا ان کے لکھنے کے مکلّف نہیں ہیں؟ قرآنِ مجید کے عام الفاظ ﴿یعلمون ما تفعلون﴾ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ نیت وارادہ کو بھی لکھتے ہیں۔ کیوں کہ جس طرح اعضاء وجوارح کا عمل ہے اسی طرح نیت دل کا فعل وعمل ہے۔ اس کی دلیل حسب ذیل حدیث سے بھی ہوتی ہے، کہ نیکی کے قصد وارادہ کو بھی لکھا جاتا ہے۔ چناں چہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا ارشاد ہے کہ

"إِذَا أَرَادَ عَبْدِيْ اَنْ يَّعْمَلَ سَيِّئَةً فَلَا تَكْتُبُوْهَا عَلَيْهِ حَتّٰـى يَعْمَلَهَا ، فَإِنْ عَمِلَهَا فَاكْتُبُوْهَا بِمِثْلِهَا وَإِنْ تَـرَكَهَـا مِنْ أَجْلِيْ فَاكْتُبُوْهَا لَهٗ حَسَنَةً ، فَإِنْ أَرَادَ أَنْ يَّـعْمَلَ حَسَنَةً فَلَمْ يَعْمَلْهَا اُكْتُبُوْهَا لَهٗ حَسَنَةً ، فَـإِنْ عَـمِلَهَا فَاكْتُبُوْهَا لَهٗ بِعَشْرِ أَمْثَالِهَا إِلٰى سَبْعِ مِائَةٍ ." [مسلم، رقم: ۳۳۶]

''میرا بندہ جب کسی گناہ کا ارادہ کرے تو اسے نہ لکھو تا آنکہ وہ اس پر عمل کرے، اگر اس پر عمل کرے تو اسی کی مثل اسے لکھو، اور اگر میری وجہ سے وہ اس ارادہ پر عمل نہ کرے تو اس کے لیے ایک نیکی لکھ دو، اور اگر کوئی نیکی کرنے کا ارادہ کرے مگر وہ عمل نہ کر سکے تو اس کے لیے ایک نیکی لکھ دو، پھر اگر اس پر عمل کرے تو اسے دس سے سات سو تک لکھو۔''

یہی روایت صحیح بخاری (۷۵۰۱) ومسلم (رقم: ۳۳۸) میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی مروی ہے۔ فرشتے چوں کہ نوری مخلوق ہیں اس لیے وہ حسی اور وجودی امور کا ادراک ہی نہیں رکھتے، بلکہ روحانی اور غیر حسی امور سے بھی مطلع ہو جاتے ہیں۔ ابومعشر سے کسی نے پوچھا کہ انسان دل میں اللہ کا ذکر کرتا ہے تو فرشتے اسے کیسے لکھ لیتے ہیں؟ انہوں نے فرمایا: وہ اس کی خوشبو پا لیتے ہیں۔

[ابن المنذر، الدر المنثور، ج: ٦، ص: ١٠٣]

یہ بات تو اپنی جگہ اہل اللہ کے ہاں محقق ہے کہ نیک اعمال کی خوشبو ہوتی ہے اور برے اعمال کی بو ہوتی ہے۔ اور وہ بسا اوقات اس کا احساس بھی پاتے ہیں۔ میرے شیخ، بلکہ شیخ العرب والعجم حضرت حافظ محمد گوندلوی رحمہ اللہ نے جب اسی حوالے سے ایک بار بخاری شریف کے درس میں گفتگو کی تو راقم نے عرض کیا کہ کیا یہ بات نظریاتی ہے یا حسی وعملی بھی؟ تو انہوں نے ارشاد فرمایا: حسی طور پر بھی اس کا احساس ہوتا ہے۔ میں نے عرض کیا اس کی کوئی مثال؟ تو ارشاد فرمایا: زانی کے جسم سے اس طرح کی بو آتی ہے جیسے حقہ پینے والے کے منہ سے آتی ہے۔

اخی ومحبی مولانا برق التوحیدی حفظہ اللہ نے ذکر کیا کہ اسی نوعیت کی بات دورانِ درس میں حضرت حافظ صاحب نے فرمائی تو میں نے عرض کیا کہ کوئی شخص ہے جس کو یہ احساس ہوتا ہے تو انہوں نے فرمایا: ہاں! سید ابوبکر غزنوی رحمہ اللہ کو اس کا احساس ہوتا تھا۔

جب اہل اللہ یہ چیز محسوس کرتے ہیں تو فرشتے کا وجود تو انتہائی لطیف ہے۔ وہ اس کا احساس بالاولیٰ پاتے ہیں اور اسی بنا پر وہ نیکی کے ارادے کو لکھتے ہیں، اور برائی کے ارادے کو اللہ کے لطف وکرم کی وجہ سے نہیں لکھتے۔ البتہ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

"إِنَّ الـلّٰـهَ تَـعَـالٰى تَجَاوَزَ لِأُمَّتِيْ عَمَّا حَدَّثَتْ بِهٖ أَنْفُسُهَا مَا لَمْ تَعْمَلْ أَوْ تَتَكَلَّمْ بِهٖ ."

[بخاری: ۵۲٦۹۔ مسلم: ۳۳۲]

''اللہ تعالیٰ میری امت کو معاف کر دیتے ہیں جو ان کے دل میں خیالات آتے ہیں، جب تک ان کو زبان سے نہ کہا ہو، یا عمل نہ کیا ہو۔''

جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے وساوس وخطرات کی معافی ہے تو ان کے لکھنے کا کیا فائدہ؟ لیکن یہ حدیث ظاہر ہے کہ حسنات کے لکھنے کے تو منافی نہیں، کیوں کہ اس میں بس سیئات کے خیالات کو معاف کرنے کا ذکر ہے۔ رہا ان کا لکھا جانا، تو حدیث سابق سے اس کی وضاحت ہوتی ہے کہ انہیں اس کی اجازت نہیں، بلکہ جس حدیث میں دل کے خیالات کو

معاف کرنے کا ذکر ہے، اس سے مراد وہ وساوس وخطرات ہیں جو لوحِ قلب پر بغیر قصد وارادہ کے آتے جاتے ہیں، اور ایسے ہی غیر اختیاری خیالات کو اللہ تعالیٰ نے معاف فرما دیا ہے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے جب حسب ذیل آیت نازل فرمائی:

﴿لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ وَ اِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَ يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ﴾

[البقرة: ٢٨٤]

''اللہ تعالیٰ ہی کی ملک ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے اگر تم اس کو ظاہر کر دو یا اسے چھپائے رکھو، اللہ بہرحال تم سے اس کا حساب لے گا، پھر جسے چاہے گا بخش دے گا اور جسے چاہے گا عذاب دے گا، اور اللہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔''

تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سخت گھبرائے کہ اگر غیر اختیاری خیالات پر بھی مؤاخذہ ہوا تو کون نجات پائے گا، دل تو ہمارے ہاتھ میں نہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو کچھ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: اس کی اطاعت کا عزم کرو اور کہو ﴿سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا﴾ کہ ہم نے حکم سن لیا اور تعمیل کی۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے یوں ہی کیا تو پھر اللہ تعالیٰ نے اس کے بعد یہ آیت نازل فرمائی:

﴿لا يكلف الله نفسا إلا وسعها﴾ کہ اللہ تعالیٰ کسی کو اس کی طاقت سے زائد تکلیف نہیں دیتا۔ اس پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم مطمئن ہو گئے۔ یہ روایت مختلف طرق سے صحیح مسلم، مسند امام احمد وغیرہ کتب میں منقول ہے اور حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ اور دیگر مفسرین نے بھی اسے نقل کیا ہے، اور امام مسلم رحمہ اللہ نے اسے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے بھی روایت کیا ہے۔

بعض حضرات نے یہ بھی فرمایا ہے کہ اس آیت میں ''حساب'' لینے کا ذکر ہے جب کہ حساب اور عقاب میں فرق ہے۔ حساب میں اگر مناقشہ نہ ہو تو اس میں عذاب کا پہلو نہیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ رحمہ اللہ نے فرمایا:

مَنْ نُوْقِشَ الْحِسَابُ هَلَكَ .

[بخاری، رقم: ٤٩٣٩]

''کہ جس کے حساب کا مناقشہ ہوا وہ ہلاک ہو گیا۔''

اور ایک حساب کی صورت محض پیش کرنے اور یاد دلانے کی ہے، مومنوں کے ساتھ تو یہی حساب ہوگا اور اسی کو قرآنِ مجید میں حساب یسیر سے تعبیر کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ جو علیم بذات الصدور ہے انہیں یاد دلا کے معاف فرما دیں گے۔

خلاصۂ کلام یہ کہ فرشتے صرف انسان کے قول وفعل کو ہی نہیں لکھتے، نیک ارادہ اور قصد کو بھی لکھتے ہیں اور یہ اللہ کا فضل وکرم ہے کہ برے ارادہ کو وہ شمار وقطار کے لیے نہیں لکھتے، بلکہ انسان اگر اس کو اللہ کے ڈر سے چھوڑ دیتا ہے تو فرشتے ایک نیکی لکھ لیتے ہیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور عکرمہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ فرشتے صرف وہی عمل لکھتے ہیں جو خیر اور شر پر مبنی ہو، ہر بول نہیں لکھتے۔

[حاكم وصححه وغيره]

جب کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک قول یوں منقول ہے کہ فرشتے پہلے تو ہر بول اور ہر کلمہ لکھتے ہیں، مگر ہفتہ میں جمعرات کے دن ان نوشتوں پر نظر ثانی کی جاتی ہے، جن میں ثواب یا عقاب ہو انہیں باقی رہنے دیتے ہیں اور باقی کو محو کر دیتے ہیں۔ اور وہ فرماتے تھے کہ قرآنِ مجید میں ﴿يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَ يُثْبِتُ وَ عِنْدَهٗٓ اُمُّ الْكِتٰبِ [الرعد: ٣٩]﴾ کا یہی مفہوم ہے۔ [ابن كثير]

اس قول سے اس اختلاف میں توفیق وتطبیق ہو جاتی ہے، اور جو حضرات فرماتے ہیں کہ جو قول ثواب وعقاب پر مبنی نہ ہو وہ نہیں لکھا جاتا، وہ فرماتے ہیں کہ قرآنِ مجید کے اسلوب سے معلوم ہوتا ہے کہ بسا اوقات کسی چیز کی ظاہر نعت وتعریف محذوف ہوتی ہے، جیسے ﴿وَكَانَ وَرَآءَهُمْ مَّلِكٌ يَّاْخُذُ كُلَّ سَفِيْنَةٍ غَصْبًا﴾ [الكهف: ٧٩]

''کہ ان کے پیچھے بادشاہ تھا جو ہر کشتی کو چھین لیتا تھا۔'' ظاہر ہے یہاں ہر کشتی نہیں، بلکہ وہی کشتی مراد ہے جو صحیح، درست اور قابل استعمال تھی۔ اسی طرح یہاں گو ﴿مَا يَلْفِظُ﴾ ہر لفظ کو شامل ہے، مگر مقصود وہی لفظ

وعمل ہے جو جزا اور سزا سے وابستہ ہے۔ لیکن یہ بات تو اپنی جگہ درست اور حقیقت ہے کہ انسان کو بے فائدہ اور لایعنی قول وعمل کی اجازت نہیں اس کی زندگی بامقصد ہونی چاہیے، بے مقصد نہیں۔ جیسا کہ ہم پہلے بھی اشارہ کر آئے ہیں۔

یہاں یہ بات پیش نگاہ رہنی چاہیے کہ آیت میں زبان کے بول اور لفظ کو لکھنے کا ذکر کرنے سے زبان کی اہمیت کی طرف بھی اشارہ ہے۔ حضرت بلال بن حارث مزنی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: انسان بسا اوقات ایسا کلمۂ خیر بولتا ہے جس سے اللہ راضی ہوجاتا ہے، مگر انسان اسے معمولی سمجھتا ہے، اسے معلوم ہی نہیں ہوتا کہ اس کا اجر وثواب کس قدر ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کے لیے اپنی رضا قیامت تک کے لیے لکھ دیتے ہیں۔ اسی طرح انسان کوئی کلمہ معمولی سمجھ کر اللہ کی ناراضی کا بولتا ہے، اسے گمان نہیں ہوتا کہ اس کا وبال کس قدر ہے، اللہ تعالیٰ اس کے سبب اس کے لیے اپنی ناراضی قیامت تک کے لیے لکھ دیتے ہیں۔[احمد، ترمذی، رقم: ۲۳۱۹ وحسنہ وصححہ ابن ماجہ، ابن کثیر]

حضرت علقمہ رحمہ اللہ جو یہ حدیث حضرت بلال بن حارث سے روایت کرتے ہیں، فرمایا کرتے تھے کہ اس حدیث نے بہت سی باتیں کرنے سے روک دیا ہے۔ زبان کا ایک بول انسان کی عزت وقار کا باعث بنتا ہے، جب کہ ایک بول اسے ذلت ورسوائی کی پسپائی میں دھکیل دیتا ہے۔ زبان کی اسی اہمیت وحیثیت کی بنا پر، جیسا کہ حدیث میں آیا ہے جسم کے باقی اعضاء ہر روز صبح اس کے سامنے عاجزی کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمارے بارے میں اللہ سے ڈر، اس لیے کہ ہم تیرے ساتھ وابستہ ہیں، اگر تو درست رہے گی ہم بھی درست رہیں گے۔ اگر تو کج رو ہوگی تو ہم بھی کج رو ہوجائیں گے۔[ترمذی، رقم: ۲٤۰۷ حسن وصححہ ابن خزیمہ]

زبان کی حفاظت کے بارے میں بہت سی احادیث مبارکہ کتب احادیث میں موجود ہیں جن کا استیعاب مشکل بھی اور اطناب کا باعث بھی ہے۔ شائقین الترغیب والترہیب (ص: ۵۲۱، ۵۴۳، ج:۳) ملاحظہ فرمائیں۔

حافظ ابن قیم رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ ''کلام'' انسان کا قیدی ہے اور جب یہ زبان سے نکلتا ہے تو انسان اس کا قیدی بن جاتا ہے۔ زبان کی دو بڑی آفتیں ہیں، ایک سے اگر بچ گیا تو دوسری سے بچنا مشکل ہے، ایک آفت کلام ہے اور دوسری آفت خاموشی وسکوت ہے، اور یہ دونوں گناہ میں ایک دوسری سے بڑھی ہوئی ہیں۔ کلمۂ حق سے ساکت رہنے والا گونگا شیطان ہے، مداہن ہے اور اللہ کا نافرمان ہے۔ کیوں کہ نہی عن المنکر سے وہ خاموش رہا، بلکہ بعض اوقات اسی بنا پر افضل الجہاد کی سعادت سے محروم رہتا ہے۔ جب کہ باطل اور غلط بات زبان پر لانے والا شیطان ناطق ہے اور اللہ کا فرمان ہے۔

اکثر لوگ انھی دو آفتوں میں پھنسے ہوئے ہیں۔ صراطِ مستقیم پر وہ ہیں جو درمیانی راہ اختیار کیے ہوئے ہیں جو باطل سے کف لسان کا اہتمام کرتے ہیں اور وہی بول بولتے ہیں جو آخرت میں انہیں نفع دینے والے ہیں، وہ بے فائدہ کلام نہیں کرتے، چہ جائیکہ وہ کلام کریں جو اس کے لیے آخرت میں نقصان کا باعث ہو۔ انسان قیامت کے دن پہاڑوں کے برابر بڑی بڑی نیکیاں لے کر آئے گا، مگر دیکھے گا کہ اس کی زبان کی آفتوں نے انہیں ملیا میٹ کردیا ہے۔ اور یوں بھی ہوگا کہ قیامت کے دن پہاڑوں جیسے بڑے بڑے گناہ لے کر آئے گا، مگر زبان سے کثرتِ ذکر کی بدولت وہ سب ختم ہوجائیں گے۔[الجواب الکافی]

اس آیت میں اللہ تعالیٰ کے فرشتوں کی ایک ذمہ داری کا ذکر ہے کہ دو نگران فرشتے ہر انسان کا نامہ اعمال لکھنے کے لیے مستعد رہتے ہیں۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے کچھ فرشتے وہ ہیں جو انسان کی حفاظت پر مامور ہیں۔ بعض وہ ہیں جو قیام میں، کچھ رکوع میں، کچھ سجود میں اور کچھ بیٹھے ہوئے اللہ کی تسبیح وتہلیل وتکبیر میں مصروف ہیں، کچھ وہ ہیں جو حاملین عرش ہیں، کچھ وہ ہیں جو عرش کا طواف کرتے ہیں، وہ بھی ہیں جو بیت معمور کا طواف کرتے ہیں اور وہ بھی ہیں جو اللہ کے حکم سے دنیا کے نظام وانصرام میں مصروف ہیں۔

غرض یہ کہ ہر ایک کی ایک نہ ایک ڈیوٹی اور ذمہ داری ہے، جسے وہ

بہر نوع پوری کر رہے ہیں۔قرآنِ مجید اور احادیث مبارکہ میں فرشتوں کا ذکر اور ان کی ذمہ داریوں کا تذکرہ ہے اور ان پر ایمان لانا ہمارے ایمان کا حصہ ہے، فرشتوں کا وجود محض تصوراتی نہیں اور نہ ہی کسی قوت ملکی یا ستاروں یا اللہ تعالیٰ کی بے انتہا قدرتوں کا نام ہے جیسا کہ بعض تجدد پسندوں اور ملحدوں نے سمجھا ہے، بلکہ یہ ایک نورانی غیر مرئی مخلوق ہے، بعض فرشتوں کا تو قرآن واحادیث میں نام بنام ذکر ہے اور ان کی ذمہ داریوں کا بھی ذکر ہے، اور ان پر ایمان، ایمان بالغیب کا ایک حصہ ہے۔

انسان کا نامہ اعمال لکھنے والے فرشتوں کو ﴿رَقِيبٌ عَتِيدٌ﴾ کہا گیا کہ وہ بڑے مستعد نگران ہیں، گویا انسان ان کی نظروں میں ہے وہ انسان کو دیکھتے ہیں، مگر انسان ان کو نہیں دیکھ سکتا، البتہ قیامت کے روز انسان فرشتوں کو دیکھے گا۔ دنیا میں انسان اپنی آنکھ اور بینائی کی کمزوری کی بنا پر انہیں نہیں دیکھ سکتا، بلکہ مضبوط ترین خردبین کے ذریعے سے بھی انہیں دیکھنے سے قاصر ہے۔ مگر قیامت کے دن انسان کی بینائی تیز اور طاقت ور کر دی جائے گی تو وہ فرشتوں کو اور جنوں کو بھی دیکھے گا، بلکہ مومن اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے دیدار سے بھی مشرف ہوگا۔ اس میں بھی اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی تقسیم اور قدرتِ کاملہ کا اظہار ہے کہ وہ اپنی مخلوق کو جس قدر چاہتا ہے جیسے چاہتا ہے قوت وطاقت عطا فرماتا ہے، اور جس کی جس طرح چاہتا ہے ذمہ داری اور ڈیوٹی لگا دیتا ہے، یہ سارے اختیارات اسی خالق ومالک اور قادرِ مطلق کے ہاتھ میں ہیں۔

اس آیت میں یہ سبق بھی ہے کہ انسان جب یہ سمجھتا ہے کہ مجھ پر دو نگران مقرر ہیں اور وہ میری ہر بات اور ہر عمل کا ریکارڈ جمع کر رہے ہیں، یہی نامہ اعمال روزِ قیامت میرے سامنے کھلی کتاب کی مانند ہوگا اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے حضور حاضر کر کے اسے کہا جائے گا کہ اپنا نامہ اعمال پڑھو، باوجودیکہ اللہ تعالیٰ سے اس کی کوئی بات چھپی ہوئی نہیں پھر بھی اس انتظام واہتمام کا ذکر انسان کے لیے زجر وتوبیخ اور اللہ سے شرم وحیا کے پہلو سے نافرمانیوں سے بچنے کا باعث ہے۔ اور مجرمین کے لیے انصاف کے تمام تر پہلوؤں کو پورا کرنے کا ایک تقاضا ہے۔

حافظ سیوطی رحمہ اللہ نے الدر المنثور (ص:١٠٥، ج:٦) میں ابوالشیخ کی کتاب العظمۃ اور شعب الایمان کے حوالے سے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ نے دو فرشتے مقرر کیے ہیں جو انسان کا نامہ اعمال لکھتے ہیں، انسان جب مر جاتا ہے تو فرشتے عرض کرتے ہیں اے ہمارے ربّ! انسان مر گیا اب ہمیں اجازت دیں کہ ہم آسمان پر چلے جائیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں آسمان تو فرشتوں سے بھرا ہوا ہے جو میری تسبیح کر رہے ہیں۔ فرشتے عرض کرتے ہیں کہ ہم زمین پر رہیں؟ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں میری زمین میری مخلوق سے بھری ہوئی ہے جو میری تسبیح کرتی ہے۔ فرشتے پوچھتے ہیں پھر ہم کہاں رہیں؟ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں تم میرے اس بندہ کی قبر پر رہو اور تم اللہ اکبر، لا الٰہ الا اللہ، سبحان اللہ پڑھو اور اس میرے بندے کے صحیفۂ اعمال میں قیامت تک لکھتے رہو۔

مگر یہ روایت سخت ضعیف ہے، کتاب العظمۃ (ص:٩٧٩، ج:٣) میں یہ روایت عثمان بن مطر کی سند سے ہے جو ضعیف ہے، بلکہ امام ابن حبان رحمہ اللہ نے فرمایا کہ وہ گھڑی ہوئی روایتیں ثقہ راویوں سے بیان کرتا ہے اور حافظ ابن جوزی رحمہ اللہ نے اسی بنا پر اسے الموضوعات (ص:٢٢٩، ج:٣) میں ذکر کیا ہے۔

بلکہ یہ روایت صحیح حدیث کے بھی معارض ہے کہ جب انسان فوت ہو جاتا ہے تو اس کا عمل منقطع ہو جاتا ہے سوائے تین چیزوں کے:

① ...... نیک اولاد جو اس کے لیے دعا کرے۔

② ...... صدقۂ جاریہ۔ ③ ...... اس کا علم جس سے لوگ فائدہ اٹھائیں۔[مسلم، رقم: ٤٢٢٣]

مگر اس میں قیامت تک فرشتوں کی تسبیحات کا ثواب انسان کے نامہ اعمال میں لکھنے کا ذکر ہے، بلکہ یہ تو قرآنِ پاک کی اس آیت کے بھی منافی ہے کہ

﴿وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى ۝﴾ [النجم: ٣٩]

''کہ انسان کو اس کے عمل کا ہی بدلہ ملے گا۔''



درسِ حدیث

توفیق الباری

"الادب المفرد" للبخاری کا اردو ترجمہ مع تشریحات وفوائد

از حضرت نواب سید صدیق حسن خان صاحب رحمہ اللہ

تسہیل: حافظ محمد اشرف سعید (نیوکرول شالامار باغ۔لاہور)

باب:إذا أصبح الضيف محروماً

جب ضیافت رہ جائے

٧٦٦ . عن عقبةَ بنِ عامر قالَ: قلتُ: يا رسولَ اللّٰه ، إنَّكَ بَعثْتَنَا فَنَنْزِلُ بقومٍ فلا يُقْرُونَا فمَا تَرَى فى ذٰلكَ؟ فقالَ لنَا: ((إنْ نَزَلْتُمْ بقَوْمٍ فأُمِرَ لَكُمْ بما ينغبى للضّيفِ فاقبَلُوْا ، فإنْ لم يَفْعَلُوا فَخُذُوا منهم حَقَّ الضَّيْفِ الَّذِى ينبغِى لهُمْ .))

[صحيح بخاری]

''عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کی آپ ہم کو کسی قوم کے پاس بھیجتے ہیں ہم وہاں جاتے ہیں وہ ہماری مہمانی نہیں کرتے ارشاد فرمایئے ہمارے لیے کیا حکم ہے ہم کیا کریں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تم کسی قوم کے پاس جاؤ تو اگر وہ تمہارے ساتھ اچھا برتاؤ کریں جو مہمان کے ساتھ کرنا چاہیے تو قبول کرو ٹھہرو اگر وہ حق مہمانی ادا نہ کریں تو تم ان سے مہمانی کا حق ان کی حیثیت کے مطابق لے سکتے ہو۔''

باب:خدمة الرجل الضيف بنفسه

میزبان کا اپنے مہمان کی خود خدمت کرنا

٧٦٧ . عن سَهْلِ بْنِ سعدٍ ، أنّ أبَا أُسَيْد السّاعدىّ دَعَا النَّبِىَّ ﷺ فى عرسِهِ وكانتِ امْرأَتُهُ خَادِمَهُمْ يومئذٍ وهى العَروس ، فقالتْ: أتدرُونَ ما أنقعتُ لرسولِ اللّٰه ﷺ؟ أنقعتُ لهُ تَمراتٍ مِنَ اللَّيْلِ فى تَوْرٍ .

''سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے ابواسید ساعدی رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی شادی کی دعوت میں بلایا اور ان کی بیوی نے جو نئی نئی دلہن تھی، ان کی میزبانی کی خدمت انجام دی۔ کہنے لگیں تم جانتے ہو کہ میں نے رسول اللہ کے لیے بطور خاص کیا تیار کیا ہے؟ میں نے آپ کے لیے رات کو ایک برتن میں کھجوریں بھگو دی تھیں۔''

باب:من قدّم إلى ضيفه طعاماً فقام يصلّى

مہمان کو کھانا پیش کر کے میزبان نماز پڑھنا شروع کر دے

٧٦٨ . عن نُعَيم بن قَعْنَبٍ قالَ: أتيتُ أَبَا ذَرٍّ فلمْ أُوَافِقْهُ ، فقلتُ لامرأتِهِ: أينَ أبو ذَرٍّ؟ قالتْ: يَمْتَهِنُ ، سَيَأتِيْكَ الآنَ فجلستُ لهُ فجاءَ ومعهُ بَعِيْرَانِ قدْ قَطَرَ أحَدَهُمَا فى عَجُزِ الآخَرِ ، فى عُنُقِ كُلِّ وَاحِدٍ منهما قربةٌ فَوَضَعَهُمَا ثم جاءَ فقلتُ: يا أَبَا ذَرٍّ ، مَا مِنْ رَجُلٍ كنتُ ألقَاهُ كَانَ أَحَبَّ لُقِيًّا منكَ ولا أَبْغَضَ إلىَّ لُقِيًّا منكَ . قال: لِلّٰهِ أبُوكَ ، وما يجمعُ هٰذا؟

قالَ: إنّى كنتُ وأدْتُ مَوْؤدَةً فى الجَاهلِيَّةِ ، أَرْهَبُ إنْ لقيتُكَ أنْ تَقُولَ: لا تَوْبَةَ لكَ ، لا مَخْرَجَ وكنتُ أرجُو أنْ تقولَ: لكَ تَوْبَةٌ ومَخْرَجٌ ، قالَ: أفى الجاهليةِ أصبتَ؟ قلتُ:

نعم، قالَ: عَفَا اللهُ عمَّا سَلَفَ، وقالَ لامرأتِهِ:
آتِيْنَا بطعَامٍ، فأبتْ، ثم أمرَها فأبتْ حتى
ارتفعتْ أصواتُهُمَا، قال: إيهٍ، فإنكنَّ لا
تَعْدُونَ ما قالَ رسولُ اللهِ ﷺ. قلتُ: وما قالَ
رسولُ اللهِ فيهنَّ؟

قالَ: ((إنّ المرأةَ ضِلَعٌ، وإنّكَ إنْ تُرِيْدُ أنْ
تُقِيْمَهَا تَكْسِرُها، وإنْ تُدَارِيْهَا فَإنَّ فيها أَوَدًا
وبُلْغَةً)) فولَّتْ فجاءتْ بثريدةٍ كأنّها قَطَاة.
فقالَ: كُلْ ولا أَهُولَنَّكَ، فَإنّي صَائِمٌ، ثم قامَ
يُصَلِّي، فجعَلَ يُهَذِّبُ الرُّكُوْعَ، ثم انْفَتل
فأكَلَ، فقلتُ: إنّا للّٰهِ ما كُنتُ أخَافُ أنْ
تَكْذِبَنِي۔

قالَ: لِلّٰهِ أبُوك، ما كَذَبْتُ منذُ لقيتَنِيْ، قلتُ:
ألَمْ تُخْبِرْنِيْ أنَّكَ صَائِمٌ؟ قالَ: بَلٰى إنّي صُمْتُ
مِنْ هٰذا الشّهرِ ثلاثةَ أيّام، فكُتِبَ لي أَجْرُهُ
وَحَلَّ لِيَ الطَّعَامُ. [حسن]

''حضرت نعیم بن قعنب سے روایت ہے کہ وہ بیان کرتے ہیں میں ابوذر کے پاس گیا میں نے ان کو نہ پایا ان کی بیوی سے پوچھا ابوذر کہاں ہیں انہوں نے کہا گھر کے کام میں ہیں ابھی آ جائیں گے میں ان کے لیے بیٹھ گیا وہ آئے ان کے ساتھ دو اونٹ تھے ایک کو دوسرے کے عجز کے ساتھ باندھا ہوا تھا ہر ایک کی گردن میں ایک مشک تھی ان کو اتار کر (نیچے رکھا) اور میرے پاس آئے میں نے کہا اے ابوذر آپ کی ملاقات سے زیادہ مجھے کسی کی ملاقات پسند نہیں اور آپ کی ملاقات سے زیادہ مجھے کسی کی ملاقات ناپسند نہیں کہا تمہاری خیر ہو یہ بتاؤ کہ دونوں کیسے جمع ہوئیں۔

میں نے کہا زمانہ جاہلیت میں ایک لڑکی کو زندہ دفن کر دیا تھا ڈر یہ لگتا تھا کہ آپ سے ملوں اور آپ کہہ دیں اب تیرے لیے کوئی توبہ نہیں اور عذاب سے بچنے کی کوئی صورت نہیں اور یہ بھی امید تھی کہ آپ کہیں گے تیرے لیے توبہ ہے، گلو خلاصی ہو سکتی ہے۔ ابوذر رضی اللہ عنہ نے کہا اچھا تم نے اس گناہ کو زمانہ جاہلیت میں کیا تھا میں نے کہا ہاں انہوں نے کہا اللہ تعالیٰ نے پہلے گناہوں کو معاف کر دیا ہے۔ اس کے بعد انہوں نے اپنی بیوی سے کہا ہمارے لیے کھانا لاؤ۔ اس نے کھانا لانے سے انکار کیا ابوذر نے پھر کہا کھانا لاؤ لیکن اس نے پھر انکار کیا یہاں تک دونوں کی آوازیں بلند ہو گئیں۔ ابوذر نے کہا کھانا لاؤ تم عورتیں رسول اللہ ﷺ کے فرمان سے ذرہ بھر نہیں بڑھ سکتیں میں نے پوچھا عورتوں کے متعلق رسول اللہ ﷺ نے کیا فرمایا ہے؟ انہوں نے کہا آپ ﷺ نے فرمایا: عورت ٹیڑھی پسلی سے پیدا ہوتی ہے اگر تو اس کو سیدھا کرنے کی کوشش کرے گا تو اس کو توڑ دے گا اور اگر تو اس سے درگزر کرے گا (تو گزارہ ہو سکتا ہے) گوکہ اس میں کجی اور ٹیڑھا پن موجود رہے گا۔ اس پر ان کی بیوی قطاط پرندے کی طرح گئیں ثرید لے کر آئیں۔

ابوذر نے کہا کھاؤ میری وجہ سے پریشان نہ ہونا میں روزہ سے ہوں۔ پھر کھڑے ہو کر نماز پڑھنے لگے اچھی طرح رکوع کیا نماز سے فارغ ہو کر کھانا کھایا میں نے کہا انا للہ مجھ کو ہرگز یہ توقع نہ تھی کہ آپ مجھ سے جھوٹ بولیں گے۔ کہا تیری خیر ہو جب سے تجھ سے ملاقات ہوئی ہے میں نے جھوٹ نہیں بولا میں نے کہا آپ نے کہا تھا میں صائم ہوں۔ کہنے لگے ہاں کہا تھا ابوذر کہنے لگے میں نے اس مہینے میں تین روزے رکھے ہیں ان کا اجر میرے لیے پورے مہینے کے روزوں کا لکھ دیا گیا ہے اور میرے لیے کھانا بھی حلال ہے۔''



احکام و مسائل

قسط نمبر ۲ آخری

کیا حالت احرام میں عورت کے لیے چہرہ ننگا رکھنا ضروری ہے؟

مسئلۂ حجاب کی روشنی میں ایک تحقیقی جائزہ

حافظ صلاح الدین یوسف

نقاب کی ممانعت کے باوجود چہرہ چھپانا ضروری ہے:

واقعہ یہ ہے کہ اس نقاب کی پوری حقیقت سے ہم آگاہ نہیں ہیں جس سے روکا گیا ہے۔ ہمارے خیال میں یہ کوئی مخصوص قسم کا نقاب تھا جس میں تکلف بھی ہوگا اور شاید عورت کے حسن و جمال کو نمایاں کرنے والا بھی۔ بہر حال اس کی اصل حقیقت کیا ہے؟ اس بحث میں پڑے بغیر چوں کہ فقہاء نے نقاب کا وہی مفہوم مراد لیا ہے جو مشہور ہے جس سے عورت کا چہرہ چھپ جاتا ہے، ہم بھی اسی کو تسلیم کرتے ہوئے گفتگو کریں گے۔

عورت کے لیے اسلام میں مسئلہ حجاب کی جتنی اہمیت ہے، محتاجِ وضاحت نہیں۔ اس لیے اس حکم کا تعلق ایک مخصوص صورت کے ساتھ ہے اور وہ یہ ہے کہ احرام والی عورت اس وقت تک اپنے چہرے کو نقاب سے نہ ڈھانپے جب تک اس کے سامنے مرد نہ ہوں یعنی مردوں کی نگاہ اس پر نہ پڑے اور جوں ہی اس پر مردوں کی نگاہ پڑنے کا امکان ہو، اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ ان سے اپنا چہرہ چھپالے۔ اس مفہوم کی تائید حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی اس روایت سے ہوتی ہے جس میں وہ فرماتی ہیں:

كَانَ الرُّكْبَانُ يَمُرُّوْنَ بِنَا وَنَحْنُ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ مُحْرِمَاتٌ فَاِذَا حَاذَوْا بِنَا سَدَلَتْ اِحْدَانَا جِلْبَابَهَا مِنْ رَأْسِهَا عَلٰى وَجْهِهَا ، فَاِذَا جَاوَزُوْنَا كَشَفْنَاهُ . [سنن ابوداؤد، حدیث: ۱۸۳۳]

"قافلے ہمارے پاس سے گزرتے تھے جب کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ احرام باندھے ہوتی تھیں، جب ان سے ہمارا سامنا ہوتا تو ہم اپنی پردے والی بڑی چادر اپنے سر سے اپنے چہرے پر لٹکا لیتیں، جب وہ ہم سے آگے گزر جاتے تو ہم اپنے چہرے پھر کھول لیتیں۔"

احرام کی حالت میں صحابیات کا چہرہ ڈھانپنے کا یہ عمل رسول اللہ ﷺ کی موجودگی میں ہوا لیکن آپ نے ان کو اس سے منع نہیں فرمایا جس سے حدیث لا تنتقب المرأة کی تخصیص ہوگئی کہ یہ حکم مطلق نہیں ہے کہ عورت حالت احرام میں اپنا چہرہ ڈھانپ ہی نہیں سکتی، بلکہ نقاب نہ لینے کا مسئلہ صرف اس وقت تک ہے جب تک مردوں کا آمنا سامنا نہ ہو، جب آمنا سامنا ہو تو پھر عورت کا ننگے منہ رہنا قطعاً جائز نہیں ہے۔

یہ چہرہ ڈھانپنا سدل کے ذریعے سے ہوا، سدل کا مطلب ہے، پردے والی بڑی چادر، جس کو جلباب کہا جاتا ہے اور عہد خیر القرون میں عورتیں پردے کے لیے یہی چادر استعمال کرتی تھیں، سر سے چادر کا پلو لٹکا کر چہرہ چھپا لینا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی مذکورہ روایت سے سدل کے ذریعے سے احرام کی حالت میں چہرہ چھپا لینے کا اثبات ہوا۔

جلباب کے علاوہ خمار (چھوٹی چادر یا دوپٹہ) کے ذریعے سے بھی چہرہ چھپا لینے کا جواز ملتا ہے، یہ خمار جلباب کے علاوہ دوپٹہ کی قبیل سے ہے اور نقاب کے ہم معنی ہی ہے۔ حضرت فاطمہ بنت منذر رحمہا اللہ فرماتی ہیں:

كُنَّا نُخَمِّرُ وُجُوْهَنَا وَنَحْنُ مُحْرِمَاتٌ وَنَحْنُ مَعَ اَسْمَاءَ بِنْتِ اَبِیْ بكر الصديق .

[موطأ امام مالك: ١/٣٢٨]

''ہم احرام کی حالت میں اپنے چہروں کو خمار (دوپٹے) سے ڈھانپ لیا کرتی تھیں اور اسماء بنت ابی بکر صدیق رضی اللہ عنہما ہمارے ساتھ ہوتی تھیں۔''

یہ فاطمہ، حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کی پوتی ہیں اور حضرت اسماء صحابیہ ہیں، ان کی موجودگی میں یہ عمل ہوا لیکن انہوں نے اس سے روکا نہیں۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ صحابہ وصحابیات مردوں کی موجودگی میں چہرہ چھپا لینے کو ضروری اور اس کے لیے خمار کے استعمال کو جائز سمجھتی تھیں۔

اب رہ گیا نقاب کے ذریعے سے چہرے کا پردہ کرنا، اس کے جواز کے بھی مذاہب اربعہ میں سے تین مذاہب (حنفیہ، شافعیہ اور مالکیہ) قائل ہیں۔ چناں چہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

ومعنى قوله "لا تنتقب" اى لا تستروجهها كما تقدم، واختلف العلماء فى ذلك فمنعه الجمهور واجازه الحنفية وهو رواية عند الشافعية والمالكية.

[فتح البارى: ٤/٧٠، طبع دارالسلام]

"لَا تَنْتَقِبْ" کے معنی ہیں کہ عورت اپنا چہرہ نہ ڈھانپے، جیسا کہ پہلے گزرا، اور علماء کا اس کی بابت اختلاف ہے۔ جمہور نے چہرہ ڈھانپنے سے منع کیا ہے اور احناف نے اس کو (چہرہ ڈھانپنے کو) جائز قرار دیا ہے اور ایک روایت کی رو سے شافعیہ اور مالکیہ نے بھی اس کی اجازت دی ہے۔''

یہی بات علامہ بدرالدین عینی حنفی رحمہ اللہ نے بھی لکھی ہے۔

ومعنى "لا تنتقب" لا تستروجهها، واختلفوا فى ذلك فمنعه الجمهور واجازه الحنفية وهو رواية عن الشافعية والمالكية.

[عمدة القارى: ١٠/٢٩٦، طبع ٢٠٠٣ء]

ان دونوں عبارات سے معلوم ہوا کہ نقاب لینا اکثر علماء وفقہاء کے نزدیک اگرچہ ممنوع ہے لیکن مذاہب اربعہ میں سے تین کے نزدیک اس کا جواز ہے۔ ان مجوزین میں احناف بھی شامل ہیں۔

مذکورہ حوالہ جات سے واضح ہوا کہ احرام کی حالت میں بھی عورت کے لیے چہرہ ننگا رکھنا ضروری نہیں ہے بلکہ اس کو مردوں کی موجودگی میں ڈھانپنا ضروری ہے، وہ چاہے سر کی طرف سے چادر لٹکا کر چہرہ چھپا لے یا خمار (دوپٹے وغیرہ) کے ذریعے سے یا نقاب کے ذریعے سے۔ تینوں طریقے سے اس کے لیے چہرہ چھپانا جائز بلکہ مردوں کی موجودگی میں ضروری ہے۔

سدل کے ذریعے سے چہرہ چھپا لینا بالاتفاق جائز ہے:

علاوہ ازیں جو بھی اختلاف ہے، وہ صرف نقاب کے ذریعے سے چہرہ ڈھانپنے میں ہے، کیوں کہ اس کی ممانعت ایک حدیث میں آئی ہے۔ ورنہ جہاں تک چہرہ ڈھانپنے کا تعلق ہے، اس کے جواز کے سب قائل ہیں۔ البتہ اکثریت یہ کہتی ہے کہ نقاب کے بجائے سدل کے ذریعے سے چہرہ ڈھانپا جائے۔ اس طرح چہرہ ڈھانپنا بالاتفاق جائز ہے۔ سدل کا مطلب پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ بڑی چادر کا پلو سر سے نیچے لٹکا کر چہرے کو ڈھانپ لیا جائے۔ چند حوالے ملاحظہ ہوں:

⊙ ...... حافظ ابن حزم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

ولا بأس ان تسدل المرأة الثوب من علٰى رأسها علٰى وجهها۔ اما امر المرأة فلان رسول الله صلى الله عليه وسلم انما نهٰى عن النقاب ولا يسمى السدل نقاباً، فان كان البرقع يسمّٰى نقابا لم يحل لها لباسه، اما اللثام فانه نقاب بلا شك فلا يحل لها. [المحلى: ٧/٩١]

''عورت کے سدل کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے یعنی وہ کپڑے کو اپنے سر کی طرف سے اپنے چہرے پر ڈال کر پردہ کر لے۔ اس لیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نقاب سے منع فرمایا ہے اور سدل کو نقاب نہیں کہا جاتا۔ اگر برقع بھی نقاب کی

تعریف میں آتا ہے تو اس کا پہننا بھی جائز نہیں، جہاں تک لثام (ہونٹوں پر باندھا جانے والے کپڑے) کا تعلق ہے تو وہ بلاشبہ نقاب ہے، وہ عورت کے لیے جائز نہیں۔''

⊙......حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

ولم يختلفوا في منعها من ستر وجهها وكفَّيها بما سوى النقاب والقُفَّازين .

[فتح الباری: ٤/ ٧٠، طبع دارالسلام]

اس عبارت کا مطلب یہ ہے کہ چہرے اور ہتھیلیوں کو نقاب اور دستانوں کے ذریعے سے چھپانے کے بارے میں اختلاف ہے (جمہور کے نزدیک ان کا چھپانا ناجائز اور احناف، شوافع اور مالکیہ کے نزدیک جائز ہے) لیکن ان کو نقاب اور دستانوں کے علاوہ کسی اور چیز کے ذریعے سے چھپا لیا جائے تو ایسا کرنا بالاتفاق جائز ہے، اس میں کسی کا اختلاف نہیں ہے۔

⊙......علامہ سید سابق مصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

قال العلماء فان سترت وجهها بشيءٍ فلا بأس

''علماء نے کہا ہے کہ اگر احرام والی عورت نقاب کے علاوہ کسی اور چیز سے اپنا چہرہ چھپالے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔''

پھر وہ دو باتیں جو مشہور ہیں، حاشیے میں ان کی تردید کرتے ہیں، فرماتے ہیں:

اشتراط المجافاة عن الوجه ضعيف لا اصل له، افاده ابن القيم۔ كذالك حديث، احرام الرجل في رأسه واحرام المرأة في وجهها .

[فقه السنة: ١/ ٥٦٩، طبع ١٩٨٣ء]

''یہ شرط کہ کپڑا چہرے سے دور رہے، اس سے مس نہ کرے، ضعیف ہے۔ اس کی کوئی اصل نہیں۔ (افادت ابن القیم) اسی طرح یہ حدیث بھی (بے اصل ہے کہ) مرد کا احرام اس کے سر میں ہے اور عورت کا احرام اس کے چہرے میں ہے۔''

وقال ابن المنذر: اجمعوا علٰى ان المرأة تلبس المخيط كله والخفاف، وان لها ان تغطي رأسها وتستر شعرها الا وجهها فتسدل عليه الثوب سدلاً خفيفا تستر به عن نظر الرجال، ولا تخمره الا ما روى عن فاطمة بنت المنذر، قالت: "كنا نخمر وجوهنا ونحن محرمات مع اسماء بنت ابى بكر" تعني جدتها قال: ويحتمل ان يكون ذلك التخمير سدلا كما جاء عن عائشة قالت: كنا مع رسول الله ﷺ إِذَا مَرَّ بِنَا رَكْبٌ سَدَلْنَا الثَّوْبَ عَلٰى وُجُوْهِنَا وَنَحْنُ مُحْرِمَاتٌ فَإِذَا جَاوَزَنَا رَفَعْنَاهُ .

[فتح الباری: ٣/ ٥١١، ٥١٢]

''امام ابن المنذر نے کہا: اس بات پر اجماع ہے کہ (احرام والی عورت) ہر قسم کے سلے ہوئے کپڑے اور موزے پہن سکتی ہے، اپنا سر ڈھانپے اور بالوں کو چھپائے، سوائے چہرے کے۔ ہاں اوپر سے (چادر کے ذریعے سے پلو لٹکا کر) چہرے کو ہلکا سا اس طرح چھپالے کہ مردوں کی نظروں سے پردہ ہو جائے۔ اس کو خمار سے نہ ڈھانپے۔ البتہ حضرت فاطمہ بنت منذر سے مروی ہے کہ ''ہم اپنے چہروں کو خمار سے ڈھانپ لیتی تھیں جب کہ ہم احرام کی حالت میں ہوتی تھیں (ہماری دادی) حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا ہمارے ساتھ ہوتی تھیں۔'' ابن المنذر نے کہا کہ یہ احتمال ہے چہرے کو خمار سے ڈھانپنا سدل کے طور پر ہو یعنی اوپر سر کی طرف سے (جس کی اجازت سب علماء نے دی ہے) جیسے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے، وہ کہتی ہیں کہ ''ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے، جب ہمارے پاس سے (مردوں کا) قافلہ گزرتا تو ہم اپنے چہروں کو سدل کے ذریعے سے چھپا لیتی تھیں یعنی پردے والی چادر لٹکا کر اپنے

چہروں پر ڈال لیتی تھیں جب کہ ہم احرام کی حالت میں ہوتی تھیں، جب قافلہ ہم سے آگے گزر جاتا تو ہم اپنے چہروں سے چادر ہٹا لیتیں۔''

⊙......امام ابن قدامہ فرماتے ہیں:

وجملة ذلك ان المرأة يحرم عليها تغطية وجهها في احرامها كما يحرم على الرجل تغطية رأسه، لا نعلم في هذا خلافا الا ما روى عن اسماء انها كانت تغطي وجهها وهي محرمة، ويحتمل انها كانت تغطيه بالسدل عند الحاجة فلا يكون اختلافا.

''خلاصہ یہ ہے کہ احرام کی حالت میں عورت کے لیے اپنا چہرہ ڈھانپنا اسی طرح حرام ہے جیسے مرد کے لیے اپنا سر ڈھانپنا حرام ہے، اس میں ہمارے علم کے مطابق کوئی اختلاف نہیں۔ البتہ حضرت اسماء رضی اللہ عنہا (بنت ابی بکر) سے مروی ہے کہ وہ حالت احرام میں اپنا چہرہ ڈھانپ لیتی تھیں۔ یہ احتمال ہے کہ وہ بوقت ضرورت سدل کے ذریعے سے اپنا چہرہ چھپا لیتی ہوں گی، اس صورت میں کوئی اختلاف نہیں رہتا۔''

المغنی کے اسی مقام پر امام ابن المنذر کے حوالے سے لکھا گیا ہے کہ حدیث ہے لا تنتقب المرأة ''عورت نقاب نہ لے۔ (اس کے بعد لکھا ہے)

فاما اذا احتاجت الى ستر وجهها لمرور الرجال قريباً منها فانها تسدل الثوب عن فوق رأسها علىٰ وجهها، روى ذلك عن عثمان وعائشة وبه قال عطاء ومالك والثوري والشافعي واسحٰق ومحمد بن الحسن ولا نعلم فيه خلافا وذلك لما روى عن عائشة رضي الله عنها قالت: كان الركبان يمرون بنا ونحن محرمات مع رسول الله ﷺ، فاذا حاذونا سدلت احدانا جلبابها من رأسها على وجهها فاذا جاوزونا كشفناه، رواه ابوداؤد والاثرم، ولان بالمرأة حاجة الى ستر وجهها فلم يحرم عليها ستره على الاطلاق كالعورة.

[المغنی، لابن قدامة: ۳/۱۵٤، طبع دارالفکر ۱۹۸۵ء]

''لیکن جب قریب سے مردوں کے گزرنے کی وجہ سے اسے اپنا چہرہ چھپانے کی ضرورت پیش آجائے تو وہ سدل کرلے یعنی اپنے سر کے اوپر سے چادر لٹکا کر اپنے چہرے پر ڈال لے۔ یہ بات حضرت عثمان وحضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے۔ اسی کے قائل عطاء، امام مالک، ثوری وامام شافعی، اسحٰق اور محمد بن حسن بھی ہیں اور اس میں ہمیں کسی کا اختلاف معلوم نہیں۔ اور اس مسئلے کی بنیاد حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی یہ روایت ہے جس میں وہ بیان فرماتی ہیں کہ ''جب ہم رسول اللہ ﷺ کی معیت میں احرام باندھی ہوئی تھیں تو مردوں کے قافلے گزرتے اور وہ ہمارے قریب آجاتے تو ہم میں سے ایک عورت اپنے سر کی چادر اپنے چہرے پر ڈال لیتی، جب وہ ہم سے دور چلے جاتے تو ہم اپنے چہرے کھول لیتیں'' اس کو امام ابوداؤد اور اثرم نے روایت کیا ہے۔ علاوہ ازیں چہرہ ڈھانپنا عورت کی ضرورت ہے، اس لیے چہرہ ڈھانپنا مطلقاً اس کے لیے حرام نہیں ہے جیسے قابل ستر چیز کا ڈھانپنا اس کے لیے ضروری ہے۔''

آگے وہ اس بات کی بھی وضاحت کرتے ہیں کہ چہرہ زیادہ دیر ڈھانپنے پر اسے فدیہ پڑنے والی جو بات ہے، وہ نہ امام احمد سے منقول ہے اور نہ وہ حدیث ہی میں ہے، اس لیے یہ بے بنیاد ہے۔

⊙...... مدینے کے فقہائے سبعہ میں سے ایک فقیہ قاسم بن محمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

تَلْبَسُ المحرمةُ السَّرَاوِيْلَ وَالْقُفَّازَيْن وَتُخَمِّرُ

وَجْهَهَا كُلَّهُ . [مصنف ابن ابی شیبہ : ٤/ ٩٢]

''احرام والی عورت شلوار پہن سکتی ہے، دستانے پہن سکتی ہے اوراپنا چہرہ مکمل طور پرڈھانپ سکتی ہے۔''

⊙...... شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ ؒ نقاب اور دستانوں کی ممانعت کاذکر کرنے کے بعدفرماتے ہیں:

ولو غطت المرأة وجهها بشىء لا يمس الوجه جاز بالاتفاق وان كان يمسه فالصحيح انه يجوز ايضا ، ولا تكلف المرأة ان تجافى سترتها عن الوجه لا بعود ولا بيدٍ ولا غير ذلك . فان النبى ﷺ سوى بين وجهها ويديها وكلاهما كبدن الرجل لا كرأسه .

وازواجه ﷺ كن يسدلن على وجوههن من غير مراعاة المجافاة ، ولم يقل احد من اهل العلم عن النبى ﷺ انه قال: "احرام المرأة فى وجهها" وانما هذا قول بعض السلف .

[مجموعة الفتاوىٰ : ٢٦/ ١١٢]

''اگرعورت (نقاب کے بجائے) کسی اور چیز سے اپنا چہرہ ڈھانپ لےاوروہ اس کے چہرے کومس نہ کرے تو یہ بالاتفاق جائز ہےاوراگرمس بھی کرلےتب بھی صحیح مذہب کے مطابق جائز ہے۔عورت کواس بات کا مکلّف (ذمے دار) نہیں بنایا جاسکتا کہ وہ (چہرہ ڈھانپتے وقت) اپنے پردے کواپنے چہرے سے دوررکھے،کسی لکڑی کے ساتھ یاہاتھ کے ساتھ یاکسی اور چیز کے ساتھ۔اس لیے کہ نبی ﷺ نےعورت کے چہرے اور اس کے ہاتھوں کو یکساں قرار دیا ہے اور یہ دونوں چیزیں ایسی ہیں جیسے مرد کا بدن ہے، یہ چیزیں مرد کے سر کی طرح نہیں ہیں (کہ ان کوعورت کے لیے احرام کی حالت میں مرد کے سر کی طرح ڈھانپنا ضروری ہو۔)

اور نبی ﷺ کی ازواج مطہرات (حالت احرام میں) اپنے چہروں کواپنے پردے والی بڑی چادر سے اس کوسر سے لٹکا کر چھپالیا کرتی تھیں اوراس کا اہتمام نہیں کرتی تھیں کہ وہ چادر چہرے سے دوررہے (اس کے ساتھ مس نہ کرے) اور یہ جوکہا جاتا ہے کہ''عورت کا احرام اس کے چہرے میں ہے'' یہ سلف میں سے کسی کا قول ہے، کسی بھی عالم نے یہ نہیں کہا کہ یہ نبی ﷺ کی حدیث ہے۔''

شیخ عثیمین ؒ سے پوچھا گیا،محرم عورت کس طرح پردہ کرے اور کیا یہ شرط ہے کہ کپڑا اس کے چہرے کو نہ چھوئے؟

انہوں نے جواب دیا: محرم عورت جب مردوں کے پاس سے گزرے یا غیرمحرم مرداس کے پاس سے گزریں تو اس کے لیے اپنے چہرے کو ڈھانپ لینا واجب ہے جیسا کہ صحابہ کرام کی عورتیں کیا کرتی تھیں۔اس حالت میں اس پر کوئی فدیہ لازم نہ ہوگا کیوں کہ اس کا اسے حکم دیا گیا ہےاورجس چیز کا شرعاً حکم ہو وہ ممنوع میں تبدیل نہیں ہوتی۔ یہ کوئی شرط نہیں کہ کپڑا اس کے چہرے کو نہ لگے،لہٰذا اگر کپڑا چہرے کو لگ جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ جب تک وہ مردوں کے پاس ہو چہرے کو ڈھانپنا واجب ہے اور جب خیمے یا گھر میں داخل ہوتو اپنے چہرے کوننگا کرلے۔''

[فتاویٰ ارکان اسلام،ص:۴۲۷،طبع دارالسلام]

حالت احرام میں بھی مردوں کی موجودگی میں عورت کے لیے اپنا چہرہ اور ہاتھ کھلے رکھنا جائز نہیں ہے۔

سعودی عرب کی فتویٰ کمیٹی کا متفقہ فتویٰ:

آخر میں سعودی علماء کا متفقہ فتویٰ بھی ملاحظہ فرمالیں۔سعودی عرب کے کبار علماء پر مشتمل فتویٰ کمیٹی سے حسب ذیل سوال کیا گیا:

سوال: عورت دورانِ نماز چہرے اور ہاتھوں کے علاوہ تمام کی تمام واجب الستر ہے، اگر وہ دورانِ حج یا عام سفر میں اجنبی لوگوں کے ساتھ ہو اور ان کے ساتھ نماز باجماعت ادا کرتی ہو، تو کیا اس صورت میں دورانِ نماز وہ اپنا چہرہ اور ہاتھ کھلے رکھ سکتی ہے، یا اجنبی لوگوں کی وجہ سے

انہیں ڈھانپنا چاہیے؟ کیا اسی طرح مسجد الحرام میں اسے اپنے چہرے اور ہاتھوں کو ڈھانپنا چاہیے یا وہ انہیں کھلا رکھ سکتی ہے؟

جواب: آزاد عورت تمام کی تمام واجب الستر ہے۔ علماء کے صحیح ترین قول کی رو سے اس پر اجنبی لوگوں کی موجودگی میں اپنا چہرہ اور ہاتھ کھولنا حرام ہے، وہ حالت نماز میں ہو، حالت احرام میں ہو یا عام حالات میں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

''ہم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ احرام کی حالت میں تھے، قافلے ہمارے پاس سے گزرتے، جب وہ ہمارے بالمقابل (سامنے) آتے تو ہم میں سے ہر ایک عورت اپنا دوپٹہ اپنے سر سے اپنے چہرے پر لٹکا لیتی اور جب وہ گزر جاتے تو ہم انہیں کھول لیتیں۔'' [ابوداؤد، ابن ماجه واحمد]

جب حالت احرام کا یہ عالم ہے حالاں کہ اس میں چہرہ کھلا رکھنا مطلوب ہے تو دیگر حالات میں تو یہ بطریق اولیٰ ہوگا۔'' [دارالافتاء کمیٹی]

(منقول از ''فتاویٰ برائے خواتین'' ص: ۱۵۵، طبع دارالسلام، الریاض، لاہور)

حرفِ آخر:

اس تفصیل سے واضح ہے کہ اب چوں کہ تمام مقامات حج پر مردوں کا بے پناہ ہجوم ہوتا ہے اور کوئی جگہ ایسی نہیں جہاں مرد نہ ہوں اس لیے عورت کے لیے ضروری ہے کہ وہ حالت احرام میں بھی اپنا چہرہ ہر جگہ ڈھانپ کر رکھے، اس کے لیے کسی قسم کے تکلف کی ضرورت نہیں، جس طرح بھی وہ چہرہ ڈھانپ سکتی ہے ڈھانپے، بڑی چادر سے، برقع والے نقاب سے یا سکارف سے یا کسی اور طریقے سے۔ چہرہ کھلا رکھنا اس کے لیے قطعاً جائز نہیں ہے سوائے محرم مردوں کے۔ اس میں کسی کا اختلاف نہیں ہے۔ مردوں کی موجودگی میں سب کے نزدیک بالاتفاق چہرہ چھپانا ضروری ہے۔ واللہ اعلم



احکام ومسائل

قسط نمبر ۲ آخری

اسلام کا نظام حدود......معاشرتی امن کا ضامن

امان اللہ عاصم (جامعہ عمر بن الخطاب جھبراں، شیخوپورہ اعزازی خطیب بی بی کوٹ ننکانہ صاحب)

لواطت:

کسی مرد کا جنسی تسکین کے لیے کسی مرد یا عورت کی دبر میں مباشرت کرنا لواطت کہلاتا ہے۔ اس عمل کی ابتداء جناب لوط علیہ السلام کی قوم نے کی۔ اس کی سزا بھی قرآن نے بیان کی ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ فَلَمَّا جَاءَ أَمْرُنَا جَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَأَمْطَرْنَا عَلَيْهَا حِجَارَةً مِنْ سِجِّيلٍ مَنْضُودٍ ﴾ [هود: ۸۲]

''جب ہمارا عذاب آیا تو ہم نے اس (بستی) کو الٹا پھینک دیا اس کے اوپر کو نیچے کر دیا اور ان پر تہہ بہ تہہ پتھر برسائے۔''

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کا فرمان ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"من وجدتموه يعمل عمل قوم لوط فاقتلوا الفاعل والمفعول به."

[المستدرك للحاكم: ٤/ ٣٩٥، حديث: ٨٠٤٧]

''اگر تم کسی کو قوم لوط والا عمل (لواطت) کرتے دیکھو تو فاعل ومفعول دونوں کو قتل کر دو۔''

قذف (تہمت):

قذف کے معنی ہیں تیر چلانا، کنکریاں پھینکنا، الزام تراشی کرنا، کسی شخص کا کسی دوسرے شخص پر بہتان رتہمت لگانا قذف کہلاتا ہے۔

شرعی طور پر قذف (تہمت) کی دو قسمیں ہیں:

① ......کسی پاک دامن شخص پر زنا کی تہمت لگانا۔ اس تہمت کے مرتکب کو حد لگائی جائے گی۔

② ......زنا کے علاوہ کسی دوسرے معاملے میں تہمت لگانا۔

تہمت کی حد:

جس طرح انسان کی جان محترم اور قابل احترام ہے اسی طرح اس کی عزت بھی محترم ہے۔ کسی کی عزت پر تہمت لگانے والے کے لیے اسلام نے سزا مقرر کی ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَالَّذِينَ يَرْمُونَ الْمُحْصَنَاتِ ثُمَّ لَمْ يَأْتُوا بِأَرْبَعَةِ شُهَدَاءَ فَاجْلِدُوهُمْ ثَمَانِينَ جَلْدَةً وَلَا تَقْبَلُوا لَهُمْ شَهَادَةً أَبَدًا، وَأُولَئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ۔ إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا مِنْ بَعْدِ ذَلِكَ وَأَصْلَحُوا فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴾ [النور: ٤، ٥]

''جو لوگ پاک دامن عورتوں پر (زنا، بے حیائی کی) تہمت لگائیں اور اس پر چار گواہ بھی نہ پیش کر سکیں تو ان کو اسی کوڑے مارو اور کبھی ان کی گواہی قبول نہ کرو، دراصل یہی بدکار ہیں۔ ہاں جو اس کے بعد توبہ کر لیں اور اپنی اصلاح کر لیں تو اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔''

اس آیت کریمہ سے واضح ہوتا ہے کہ جو شخص کسی پر زنا کی جھوٹی تہمت لگائے کہ اس کے نسب کو عیب دار کرنے کی کوشش کرے تو اس پر حد نافذ کی جائے گی اور اس کی حد اسی کوڑے ہے، اور اسکی کبھی گواہی بھی قبول نہ کی جائے گی۔ آیت کے آخری الفاظ یہ واضح کرتے ہیں کہ اگر وہ سچے دل سے توبہ کر لے اور آئندہ ایسا نہ کرنے کا عزم کرے تو پھر اس کی گواہی قبول کر لینے کی صورت بن سکتی ہے۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس جرم تہمت کی سزا

صرف اسی کوڑے اس لیے رکھی گئی ہے کہ کسی فعل بد (لواطت) کی اشاعت اتنا بڑا گناہ نہیں جتنا کہ اس کا ارتکاب ہے۔

ملکی قانون:

پاکستان میں نافذ جرم قذف کے قانون مجریہ ۱۹۷۹ء کی دفعہ ۵ میں مذکور ہے کہ جو کوئی بھی بالغ ہوتے ہوئے قصداً اور بلاابہام کسی خاص شخص کے خلاف؛ جو محصن ہو اور جماع کرنے پر قادر ہو، قذفِ زنا مستوجب حد کا ارتکاب کرے تو وہ اس آرڈیننس کے احکام کے تابع قذف مستوجب حد کا مرتکب کہلائے گا۔ اور اسی قانون کی دفعہ ۷ میں درج ہے کہ جو کوئی بھی قذف مستوجب حد کا ارتکاب کرے اسے اسی (۸۰) کوڑوں کی سزادی جائے گی۔ اس کی گواہی کسی عدالت میں قابل سماعت (قابل قبول) نہیں ہوگی۔

سرقہ (چوری، ڈکیتی):

کسی کے مال کو محفوظ جگہ سے پوشیدہ طور پر لے جانے کو سرقہ یا اسراق کہتے ہیں۔ اس شخص کو سارق کہا جائے گا جو پوشیدہ طور پر محفوظ چیزوں کے پاس آئے اور ان چیزوں کو اٹھا کرلے جائے جو اس کی ملکیت نہ ہوں۔ [قاموس العصری، مادہ: س ر ق]

سرقہ کی اقسام:

سرقہ کی دو بنیادی اقسام ہیں:

① ......سرقہ موجب تعزیر ② ......سرقہ موجب حد

① ......سرقہ موجب تعزیر:

ایسی چوری جس پر شریعت کی مقرر کردہ سزا (حد) تو نہ نافذ کی جائے البتہ اس کے مرتکب کو حاکم/قاضی وقت کی طرف سے بطور تنبیہ کچھ سزادی جائے۔

② ...... سرقہ موجب حد:

ایسی چوری (سرقہ) جس پر اس کا مرتکب شریعت کی مقرر کردہ سزا (حد) کا مستحق ٹھہرے۔ اس کی دو قسمیں ہیں:

① ......سرقہ صغریٰ ② ......سرقہ کبریٰ

① ...... سرقہ صغریٰ:

کسی دوسرے کا مال اس کی رضامندی کے خلاف خفیہ طور پر حاصل کرنا اور اس مال کی تعداد/قیمت حد کا تقاضا کرتی ہو۔

② ...... سرقہ کبریٰ:

کسی دوسرے کا مال اس کی موجودگی میں زبردستی/طاقت کا استعمال کر کے چھین لینا۔ مسروقہ/چھینا ہوا مال حد کا تقاضا کرتا ہو۔ اس کو حرابہ (رہزنی) بھی کہتے ہیں۔

توجہ طلب امور:

مسروقہ مال کے بارے چند امور توجہ طلب ہیں:

① ......مسروقہ مال پوشیدہ طور پر حاصل کیا گیا ہو۔ اس مال کے مالک کو اس مال کے چرائے جانے کا علم نہ ہو اور نہ اس کی رضامندی اس میں شامل ہو اور مال بھی محفوظ مقام سے چرایا گیا ہو۔

② ......وہ مال ایسا ہو جو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کیا جا سکتا ہو۔

③ ......وہ مال قیمت والا ہو بے وقعت مال کی چوری پر حد نافذ نہ ہوگی مثلاً: گھاس، گری پڑی لکڑیاں وغیرہ۔ ناجائز اور حرام امور میں استعمال ہونے والی اشیاء کی چوری پر بھی حد نافذ نہ ہوگی۔ مثلاً: طبلہ، سارنگی، آلات لہوولعب وغیرہ۔

④ ...... مال پوشیدہ طور پر (چوری) حاصل کرنے والے کی ملکیت نہ ہو۔ مثلاً: ایک آدمی کی ملکیت میں کچھ مال ہے اور وہ اسے کسی وجہ سے ظاہری طور پر نہیں لے سکتا تو وہ اس مال کو حاصل کرنے کے لیے پوشیدہ طریقہ اختیار کرے تو اس پر حد نہ ہوگی۔

⑤ ......درخت کے پھلوں، دودھ، گوشت اور کھیت کی کھڑی فصل کی چوری پر حد نافذ نہ ہوگی۔

سارق (چور) کی سزا:

سارق (چور) نے جو مال چوری کیا وہ اگر حد کے تقاضے پورے کرتا ہو تو اس پر حد نافذ کی جائے گی اس کی حد (سزا) یہ ہے کہ اس کا ہاتھ کاٹ دیا جائے گا۔

اللہ کا فرمان ہے:

﴿وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْا أَيْدِيَهُمَا جَزَآءً بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ﴾ [المائدة: ٣٨]

''چور مرد اور چور عورت کے ہاتھ کاٹ دو، یہ ان کے کیے کی سزا اور اللہ کی طرف سے عبرت ہے۔ اللہ تعالیٰ غالب حکمت والا ہے۔''

مسروقہ مال کم از کم ڈھال کی قیمت کے برابر ہو۔ حدیث مبارکہ میں ہے: عہد نبوی میں ڈھال کی قیمت سے کم چوری پر ہاتھ نہیں کاٹا جاتا تھا۔[صحیح مسلم: کتاب الحدود، باب حدالسرقة ونصابها، حدیث: ١٦٨٥]

ڈھال کی قیمت بھی روایات میں ذکر کی گئی ہے لیکن اگر اسی پر عمل کیا جائے تو اعتبار اس کی موجودہ قیمت کا کیا جائے گا بلکہ ایک روایت میں ہے:

"لعن الله السارق يسرق البيضة فتقطع يده ويسرق الحبل فتقطع يده." [صحيح مسلم: كتاب الحدود، باب حد السرقة ونصابها، حديث: ١٦٨٧]

''اللہ پاک اس پر لعنت کرے جو انڈہ چرائے اور اس کا ہاتھ کاٹ دیا جائے اور معمولی رسی چرائے اور اس کا ہاتھ کاٹ دیا جائے۔''

جمہور محدثین کے بقول اعمش جو اس روایت کے راوی ہیں وہ فرماتے ہیں: انڈہ سے مراد لوہے کا انڈہ یعنی ڈھال ہے۔ یعنی چوری ہلکی چیز کی ہو یا قیمتی کی بحیثیت جرم یکساں ہے۔ لہٰذا ایسی چوری جو مذکورہ نصاب تک پہنچے اس کے مرتکب کا ہاتھ کاٹ دیا جائے۔

حدیث مبارکہ میں آتا ہے: نبی اکرم ﷺ کے پاس ایک چور لایا گیا تو آپ نے اس کا ہاتھ کاٹ کر اس کے گلے میں لٹکا دینے کا حکم دیا۔

جب چور پر حد نافذ ہو جائے تو اس کے بعد اس پر کوئی جرمانہ نہیں ہے۔[سنن الدارقطنی: ٣/ ١٨٢، حدیث: ٢٧٥]

جو آدمی چوری کی ایک بار حد کے بعد بھی اس جرم کا ارتکاب کرے تو اس کے بارے نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

چوری کرنے والے کا ہاتھ کاٹ دو پھر بھی وہ چوری کرے تو اس کا ایک پاؤں کاٹ دو۔ پھر چوری کرے تو دوسرا ہاتھ کاٹ دو پھر بھی باز نہ آئے تو دوسرا پاؤں بھی کاٹ دو۔

[سنن الدارقطنی: ٣/ ١٨١، حدیث: ٢٩٢]

حرابہ (رہزنی) کی سزا:

رہزنی کرنے والوں کے لیے سزا قرآن نے مقرر کر دی ہے۔ اللہ پاک کا ارشاد گرامی ہے۔

﴿إِنَّمَا جَزَاءُ الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهُ وَيَسْعَوْنَ فِي الْأَرْضِ فَسَادًا أَنْ يُّقَتَّلُوْا أَوْ يُصَلَّبُوْا أَوْ تُقَطَّعَ أَيْدِيْهِمْ وَأَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلَافٍ أَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْأَرْضِ ذٰلِكَ لَهُمْ خِزْيٌ فِي الدُّنْيَا وَلَهُمْ فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ﴾

''جو لوگ اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کریں اور زمین پر فساد کرتے پھریں ان کی یہی سزا ہے کہ قتل کر دیے جائیں یا سولی چڑھا دیے جائیں یا ان کے ہاتھ پاؤں مخالف سمت سے کاٹ دیے جائیں یا ملک سے نکال دیے جائیں۔ یہ تو دنیا میں رسوائی ہے، آخرت میں ان کے لیے بڑا (بھاری) عذاب ہے۔''[المائدة: ٣٣]

قبیلہ عکل یا عرینہ کے لوگوں نے مدینہ کے اطراف کو اپنی آماجگاہ بنا رکھا تھا انہوں نے ایک چرواہے کو بھی قتل کر دیا (وہ لوگ اسی طرح دہشت اور خوف پھیلا کر لوٹ مار کرتے تھے) حضور ﷺ کو پتا چلا تو آپ ﷺ نے انہیں گرفتار کروا کر مدینہ میں بلوایا اور ان کے ہاتھ پاؤں کاٹ دیے اور قصاص (قتل کے بدلہ میں قتل) سزا بھی دی۔

[تفسیر القرطبی: ٦/ ١٤١ـ تحت آية٣٣، سورة المائدة]

راہزنی کرنے والوں کی سزا مختلف صورتوں میں مختلف ہوگی۔ مثلاً

①...... اگر صرف مال لوٹا، قتل نہیں کیا تو مخالف اطراف سے ہاتھ

پاؤں کاٹے جائیں گے۔

②...... مال بھی نہیں لوٹا اور قتل بھی نہیں کیا تو حاکم وقت انہیں خوف وہراس پھیلانے کے جرم میں قید وشہر بدری جیسی سزا دے گا۔

③...... اگر مال بھی لوٹا اور قتل بھی کیا تو وہی سزا دی جائے گی جو آنحضرت ﷺ نے قبیلہ عکل یا عرینہ کے لوگوں کو دی۔ ہاتھ پاؤں بھی کاٹ دیے اور قصاص (قتل کے بدلہ میں قتل) سزا بھی دی۔

④...... اگر مال نہیں لوٹا صرف قتل کیا تو قتل کی سزا ملے گی۔

ایک وضاحت:

اگر کوئی شخص اس گناہ کا ارتکاب کرے جس سے اس پر حد نافذ ہوتی ہو تو اس پر گواہوں کے مل جانے یا اس کے اقرار کر لینے پر قاضی رحاکم ہی اسے سزا دے سکتا ہے کوئی عام انسان از خود اگر اسے سزا دے گا تو خود قصور وار اور مجرم ٹھہرے گا۔ الا یہ کہ قاضی اسے سزا دینے کے لیے عوام کے حوالے کردے۔ علاوہ ازیں معاشرہ مزید بدامنی کا شکار ہوگا۔ اس لیے ایسے مجرم کی اطلاع سرکار (پولیس) کو دی جائے تاکہ وہ خود اس کو سزا دیں۔ جرائم حد کا مرتکب عاقل، بالغ ہو مجنون یا مجبور نہ ہو، تب اس پر حد نافذ کی جائے گی۔ اگر ایسے مجرم کو مظلوم کی طرف سے معافی مل جائے تو یہ معافی عدالت میں آنے سے پہلے تک کارگر ہوگی۔ سزا سنا دینے کے بعد معاف کرنے کو معتبر نہ سمجھا جائے گا۔

''هذا ما عندی والله اعلم بالصواب''



تحقیق وتنقید

قسط نمبر ①

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی عمر کے بارے میں تحقیقی مقالہ

از: مولانا فضل الرحمٰن بن محمد

نوائے وقت (۱۶ جولائی ۲۰۱۰ء) کے جمعہ میگزین میں بریگیڈیئر (ر) حامد سعید اختر صاحب کا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی عمر کے بارے لکھا ہوا مضمون پڑھا۔ انہوں نے اپنی فوجی سوچ وفکر کے تحت جس طرح کھلے طور پر انتہائی بے دردی سے ائمہ حدیث کی محنت شاقہ اور عرق ریزی کو پامال کیا ہے اور جس انداز میں ان کو اپنی جارحانہ تنقید کا نشانہ بنایا۔ اس سے گوروں کا وہ زمانہ یاد آ گیا جس میں انہوں نے ہندوستان کے مسلمانوں کے دلوں کو فتح کرنے کے لیے پادریوں کی ایک فوج کو مصروف کر دیا تھا اور ساتھ ہی مسلمانوں کے درمیان افتراق وانتشار کا بیج مسلمانوں کے چند ضمیر فروشوں کے ذریعہ مسلمانوں کی وحدت میں بویا تھا۔

آج جب کہ اہل اسلام کو وحدت واتحاد کی اشد ضرورت ہے۔ ایسے میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی عمر کے مسئلہ کو نمایاں کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ بریگیڈیئر صاحب کے مضمون سے معلوم ہوتا ہے۔ جس تحقیق کی وادی پرخار میں انہوں نے قدم رکھا ہے۔ اس کی حدود چار پانچ اردو انگریزی کی کتابوں تک محدود ہے۔ ان کو معلوم نہیں کہ علم الحدیث ایسا فن ہے کہ اس کی مثال دنیا کی کوئی قوم پیش نہیں کر سکتی۔ اگر انہوں نے صحیح بخاری کسی محدث سے پڑھی ہوتی تو ان کو ترجمۃ الباب اور روایت کے تعلق کو سمجھنے میں کوئی دقت پیش نہ آتی اور صحیح بخاری پر وہ کبھی طعن نہ کرتے۔

مدلس اور موضوع میں کیا فرق ہوتا ہے۔ ان کو اس کا بھی علم نہیں۔ تو انہوں نے کسی حدیث پر کیا تحقیق کرنی ہے۔ ان کو یہ بھی معلوم نہیں جو علم الحدیث پڑھنے پڑھانے میں اپنی زندگی گزارتے ہیں وہ محقق ومدقق ہونے کا دعویٰ نہیں کرتے۔ بڑے بڑے محدثین اپنی زبردست تحقیق کے بعد یہ جملہ ضرور لکھتے رہے ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب

تحقیق کی ضرورت کی وجہ:

بریگیڈیئر صاحب کو سارے پاکستان میں سے اس وقت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی عمر کے بارے میں تحقیق کرنے کی ضرورت اس لیے نہیں آئی کہ ان کی صغر سنی میں رسول اللہ ﷺ سے شادی کی بنا پر آپ پر ناقابل بیان رکیک الزام لگائے جاتے ہیں۔ لہٰذا انہوں نے نئے سرے سے تحقیق کر کے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں ثابت کیا ہے کہ شادی کے وقت ان کی عمر ۱۷ سے ۱۹ سال کی تھی۔ ان کا یہ وہم ہے کہ عائشہ صدیقہ کی عمر بڑھانے سے طاغوتی طاقتیں رکیک حملوں اور الزامات سے باز آ جائیں گی۔ ایسا کبھی نہ ہوا ہے اور نہ ہوگا۔ کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے سورۃ البقرۃ میں خود یہی اعلان کر دیا اور خطاب سید الانبیاء محمد رسول اللہ ﷺ اور آپ کے ذریعہ امت محمدیہ سے ہے۔

یہود ونصاریٰ کے بارے میں قرآنی وضاحت:

﴿ وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ الَّذِيْ جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ مَالَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴾ [البقرۃ: ۱۲۰]

''یہود ونصاریٰ اس وقت تک آپ سے ہرگز راضی نہیں ہوں گے کہ جب تک آپ ان کے طریقے کو اپنا نہیں لیتے۔ آپ کہہ دیں۔ بے شک حقیقی ہدایت اللہ کی ہدایت ہے۔ آپ کے پاس جو علم آ چکا ہے۔ اس کے بعد آپ نے اگر ان کی خواہشات

کی پیروی کی تو آپ کے لیے اللہ کی طرف سے کوئی والی ومددگار نہ ہوگا۔''

سورۃ الاحزاب میں سیّد الانبیاء ﷺ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم ملتا ہے:

﴿ وَ لَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَدَعْ اَذٰىهُمْ وَ تَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ وَ كَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ﴾ [الاحزاب: ٤٨]

''آپ نے کافروں اور منافقوں کی اطاعت نہیں کرنی اور ان کی طرف سے پہنچنے والی تکلیف کی پروا نہیں کرنی اور اللہ پر توکل کرنا ہے اور اللہ ہی کفایت کرنے والا وکیل ہے۔''

سورۃ التحریم میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ وَمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴾ [التحریم: ۹]

''اے نبی! کافروں اور منافقوں سے جہاد کریں اور ان پر سختی کریں اور ان کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ بہت بری جگہ ہے۔''

اسلامی تاریخ شاہد ہے کہ جب تک قرآنی تعلیم کے مطابق عمل ہوتا رہا۔ اہل اسلام مغلوب نہ ہوئے۔ جیسے ہی اہل اسلام نے قرآنی تعلیم سے منہ موڑ کر غیروں کی طرف دیکھا تو ذلت ورسوائی ان کا مقدر بن گئی۔ آج پھر سے ویسے ہی حالات پیدا ہو چکے ہیں۔ طاغوت پاکستان میں اپنے پنجے گاڑ چکا ہے۔ قرآنی ہدایت کو اپنانے کی بجائے بہت سے لوگ ایسے ہیں جو اس کی رضاجوئی میں لگے ہوئے ہیں۔ یہ مسلّمہ حقیقت ہے۔ جو بھی اسلام یا اسلامی تعلیم کے خلاف بولتا یا لکھتا ہے۔ طاغوتی طاقتیں اس کو آنکھوں پر بٹھاتی ہیں۔ اس کی لکھی ہوئی تحریر کو دنیا میں پھیلاتی ہیں۔

فتنہ وفساد کے ایسے دور میں اس مسئلے کو چھیڑنا یقینی طور پر اسلام دشمن قوتوں کے لیے تو باعث مسرت ہو سکتا ہے لیکن ہمارے لیے اس میں خیر کا کوئی پہلو دکھائی نہیں دیتا۔ سیدھی سی بات تو یہ ہے کہ جب عائشہ رضی اللہ عنہا کو اپنی صغر سنی کی شادی پر کوئی اعتراض نہ تھا۔ ان کے والدین کو اس میں کوئی قباحت نظر نہ آئی تو آج کسی کو کیسے حق پہنچتا ہے کہ وہ اپنی خودساختہ تحقیق سے صدیوں سے ائمہ حدیث میں طے شدہ حقیقت کو ٹھکرا دے اور امت میں انتشار کا سبب بنے۔

مضمون نگار کو شاید معلوم نہیں کہ ان جیسے کئی لوگوں نے پہلے بھی اس مسئلہ کو اچھالنے کی کوشش کی ہے۔ چوں کہ احادیث میں اس کا ذکر موجود ہے۔ لہٰذا ایسے لوگ احادیث کو پہلے مشکوک بنانے کی کوشش کرتے ہیں اور پھر اپنے دلائل کی بنیاد اٹھاتے ہیں۔ حق وسچ کو مسخ کرنے کے لیے اپنی غلط سوچ کو صحیح ثابت کرنے میں کوشاں رہتے ہیں۔ صحیح اور غیر صحیح کی تمیز سے بالا ہو کر ضعیف وموضوع روایات کا سہارا لے کر اپنی تحقیق کے صحیح ترین ہونے پر نازاں ہوتے ہیں۔ حالانکہ عموماً ان کا حال یہ ہوتا ہے کہ اگر قرآنِ حکیم کی کسی آیت مبارکہ کو بغیر اعراب لکھا جائے تو اس کو صحیح نہیں پڑھ سکتے۔ حوالے میں بھی ہیر پھیر ان کے ہاں معیوب نہیں ہوتا۔

قمری کیلنڈر:

مضمون نگار کا کہنا ہے کہ عربوں میں قمری کیلنڈر رائج نہ تھا۔ ان کو معلوم نہیں کہ جس طرح اہل عرب کو علم الانساب میں مہارت تامہ تھی۔ اسی مہارت کے ساتھ قمری تیس راتوں کے الگ الگ نام بھی انہوں نے رکھے ہوئے تھے۔ پھر مہینے کی راتوں کو تین تین راتوں میں تقسیم کر کے ان کے بھی نام ان کے ہاں معروف تھے۔ اس کی پوری تفصیل نفیس اکیڈیمی کی شائع کردہ کتاب تاریخ مسعودی کے باب ۲۶ میں دیکھی جا سکتی ہے۔ جو مروّج الذہب ومعادن الجواہر کا اردو ترجمہ ہے۔

اگر عربوں میں کوئی تاریخی کیلنڈر نہ تھا تو رسول اللہ ﷺ کی پیدائش کا تعین عام الفیل کے بعد کیسے ہوا تھا۔ اس کے بعد والے تمام واقعات ہجرت تک تاریخ دانوں نے کیسے مقرر کیے تھے۔ ظاہر ہے کہ جیسے علم الانساب زبانی سینہ بہ سینہ چل رہا تھا۔ ویسے ہی کیلنڈر کا معاملہ تھا۔

خدیجہ رضی اللہ عنہا کی عمر کے بارے میں:

حقائق کو مسخ کرنے والوں کا یہ بھی معمول رہا ہے کہ بات لمبی کی جائے اور اس میں ایسے الجھاؤ پیدا کیے جائیں کہ پڑھنے اور سننے والے

تنگ آ جائیں۔ بات تو عائشہ رضی اللہ عنہا کی عمر کی تھی لیکن بات فاطمہ رضی اللہ عنہا اور علی رضی اللہ عنہ کی پیدائش سے اس لیے شروع کی کہ ان کی عمروں میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ اور اختلاف کو مزید اجاگر کرنے کے لیے امّ المومنین خدیجہ رضی اللہ عنہا کی شادی کے وقت عمر کا بھی حوالہ دے دیا۔ بریگیڈیئر صاحب نے زرقانی اور ابن ہشام کے حوالے نقل کرتے ہوئے اصل کتابیں اور مذکورہ عبارت دیکھی ہوتی تو ان کو معلوم ہوتا کہ زرقانی میں خدیجہ رضی اللہ عنہا کی عمر کے بارے میں ابن عباس رضی اللہ عنہما سے کوئی روایت مروی نہیں۔ قسطلانی کے الفاظ ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے جب ان سے نکاح کیا تو اس وقت ان کی عمر چالیس سال تھی۔ زرقانی نے اس کی شرح میں لکھا۔ جیسے ابوسعید نے اس کو روایت کیا اور یعمری نے اسی پر اکتفا کیا۔ مغلطائی اور برہان نے اس کو مقدم کیا اور صحیح کہا۔ یہ بھی کہا گیا ہے۔ ان کی عمر پینتالیس سال تھی۔ یہ بھی کہا گیا ہے۔ تیس سال تھی۔ یہ بھی کہا گیا ہے۔ اٹھائیس سال تھی۔ اس کو مغلطائی اور دوسروں نے بیان کیا۔

[المواهب اللدنية، ج: ٣، ص: ٢٢٠]

مضمون نگار کو اصول حدیث میں معمولی سا بھی درک ہوتا تو وہ جان لیتے کہ لفظ قِيْـلَ یعنی ''کہا گیا ہے'' کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا۔ علم الحدیث میں سند دیکھی جاتی ہے۔ اگر سند متصل اور صحیح ہو تو وہ حدیث مقبول ہوتی ہے۔

سیرت ابن ہشام، ج:۱، ص:۱۸۷ (مطبعة مصطفىٰ البابي الحلبي۔ مصر) میں ابن ہشام نے رسول اللہ ﷺ کی خدیجہ رضی اللہ عنہا سے شادی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔ آپ کی عمر مبارک پچیس سال تھی۔ خدیجہ رضی اللہ عنہا کی عمر کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ حاشیے میں منقول ہے۔ خدیجہ رضی اللہ عنہا کی عمر چالیس سال تھی اور یہ بھی کہا گیا ہے۔ پینتالیس سال تھی۔

لہٰذا بریگیڈیئر صاحب کے دونوں حوالے درست نہیں۔ انہوں نے خود ہی لکھا ہے کہ جمہور کے نزدیک شادی کے وقت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی عمر چالیس سال تھی۔ جب جمہور کے نزدیک جو بات صحیح اور درست ہوگی تو پھر قِيْلَ والوں کی روایات کی کوئی حیثیت نہیں رہتی۔

امّ رومان رضی اللہ عنہا:

عائشہ رضی اللہ عنہا صدیقہ رضی اللہ عنہا کی والدہ ماجدہ کی عظمت وفضیلت میں کسی کو کوئی کلام نہیں لیکن جہاں تک ان کی وفات کا تعلق ہے تو اس میں بہت اختلاف ہے۔ جیسے زرقانی نے المواہب ج:۳، ص:۲۲۹ میں لکھا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی حیات مبارکہ میں ان کے فوت ہونے میں لمبا جھگڑا ہے اور یہ اس کے بیان کرنے کی جگہ نہیں۔

حافظ ابن حجر عسقلانی (المتوفی ۸۵۲ھ) نے فتح الباری ج:۸، ص:۵۲۱۔۵۲۲ میں اور علامہ احمد بن محمد القسطلانی (المتوفی ۹۲۳ھ) نے ارشاد الساری ج:۷، ص:۲۹۵ میں لکھا ہے کہ آیت تخییر یعنی

﴿يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ اِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَ زِيْنَتَهَا فَتَعَالَيْنَ اُمَتِّعْكُنَّ وَ اُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِيْلًا ۝ وَ اِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ فَاِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلْمُحْسِنٰتِ مِنْكُنَّ اَجْرًا عَظِيْمًا﴾

[الاحزاب: ٢٨، ٢٩]

''اے نبی! آپ اپنی بیویوں سے کہہ دیں۔ اگر تم دنیا کی زندگی اور اس کی زینت کا ارادہ رکھتی ہو تو آؤ میں تمہیں دنیا کا سامان دے کر اچھی طرح رخصت کر دوں اور اگر تم اللہ اور اس کے رسول ﷺ اور دار آخرت کا ارادہ رکھتی ہو تو اللہ نے تم میں سے اچھا عمل کرنے والیوں کے لیے اجر عظیم تیار کر رکھا ہے۔''

رسول اللہ ﷺ کی زوجیت میں رہنے یا الگ ہو جانے کا اختیار والی آیت ۹ ہجری میں نازل ہوئی اور آپ نے اس کی ابتداء حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمائی۔ آپ نے فرمایا: اے عائشہ رضی اللہ عنہا تجھ پر میں ایک معاملہ پیش کرنے لگا ہوں۔ اس میں فیصلہ کرنے میں جلدی نہ کرنا بلکہ اپنے والدین ابوبکر اور ام رومان سے مشورہ کر لینا۔ نام کے بغیر "اَبَوَيْكِ" تمام معروف تفاسیر میں منقول ہے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی اور علامہ قسطلانی کا کہنا ہے۔ اس روایت سے یہ فائدہ ہوتا ہے کہ ۹ ہجری میں امّ رومان زندہ تھیں۔ جن کا گمان ہے کہ ان کی وفات چھ ہجری میں ہوئی اس میں ان کا ردّ ہوتا ہے۔ تہذیب

التہذیب ج:١٢،ص:٤٦٨ میں ابونعیم اصبہانی کا قول ہے۔ وہ نبی ﷺ کے بعد ایک عرصہ تک زندہ رہیں۔

امام ابوجعفر محمد بن جریر الطبری (المتوفی ٣١٠ھ) نے سورۃ الاحزاب کی آیت تخییر (پ٢١،ص:١٥٨) کی شرح میں ناموں والی روایت نقل ہے۔ امام احمد بن حنبل (المتوفی ٢٤١ھ) کی مسند ج:٦،ص:٢١٢ میں بھی منقول ہے۔ الاستیعاب اور رحمۃ للعالمین کا حوالہ دیتے ہوئے بریگیڈیئر صاحب نے علمی امانت ودیانت کا بھی خیال نہیں رکھا۔ صاحب رحمۃ للعالمین نے الاستیعاب کا حوالہ نقل کرنے کے بعد حاشیے میں یہ بھی ذکر کر دیا کہ صحیح بخاری میں مسروق تابعی نے ایک حدیث امّ رومان سے روایت کی ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ امام بخاری کے نزدیک امّ رومان کی وفات بعد از وفات نبی ﷺ ہوئی۔

جبکہ بریگیڈیئر صاحب کی تحریر کے الفاظ ہیں۔ "تاہم امام بخاری نے مسروق تابعی کی روایت سے ایک حدیث امّ رومان سے منسوب کی ہے جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ امام بخاری کے نزدیک امّ رومان کی وفات بعد از وفات نبی ﷺ ہوئی تھی۔ ظاہر ہے ایسی غلطیاں لغزش بشری ہیں۔ اور ان میں کسی بدنیتی کا عمل دخل نہیں۔ بلکہ تحقیق کی خامی ہے۔ بصورت دیگر ایسی روایات کے راوی ثقل سماعت اور ضعف ذکاوت کا شکار ہو چکے تھے۔"

اس عبارت میں پہلے صاحب رحمۃ للعالمین کے جملے میں ردّ وبدل کیا۔ پھر امام بخاری جیسی عظیم شخصیت کے غلطی کے مرتکب ہونے اور ان کی تحقیق میں خامی ہونے کا نہ صرف برملا اعلان کر دیا بلکہ احادیث وروایات کے راویوں پر ثقل سماعت اور ضعف ذکاوت کا شکار ہونے کا الزام بھی لگا دیا۔

سوچنے اور سمجھنے والی بات یہ ہے کہ بریگیڈیئر صاحب تو اس زمانے میں موجود نہ تھے۔ جب احادیث کو جمع ومدوّن کیا گیا۔ نہ ان کی ان راویوں سے ملاقات ہوئی تھی کہ جن کو انہوں نے بہرے پن اور کم عقلی کا طعنہ دے دیا۔ کیا کوئی اپنے دین کی اس طرح حفاظت کرتا ہے۔ یہ دین کی حفاظت نہیں بلکہ بیرونی قوتوں سے معاونت ہے۔ اپنے ہی لوگوں میں فتنہ وفساد برپا کرنے کی شرارت ہے۔

قاضی محمد سلیمان منصوری نے مسروق کی جس روایت کا حوالہ حاشیہ میں دیا۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اس کو کتاب المغازی اور کتاب الانبیاء میں عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پر لگنے والے بہتان کے سلسلہ میں امّ رومان سے نقل کیا ہے اور اسی روایت کا امام بخاری رحمہ اللہ سے پہلے امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے امّ رومان کے ترجمہ میں ذکر کیا ہے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی بلند پایہ محدث وفقیہ اور مؤرخ تھے۔ انہوں نے اپنی زندگی میں تقریباً ١٥٠ کتابیں لکھیں۔ جن میں سے فتح الباری ٣٠٠ دینار میں فروخت ہوتی تھی۔ ٢١ سال مصر کے قاضی القضاۃ رہے۔ انہوں نے قرآنی آیت کے حوالے سے ثابت کیا کہ امّ رومان ٩ ہجری میں باحیات تھی۔ لہٰذا ان کے بارے میں ٦ ہجری میں وفات پانے والی روایت درست نہیں۔

بنیادی حقائق:

شق نمبر١: حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی عمر کے حوالے سے بریگیڈیئر کا اشکال ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی زوجیت میں ٢٥ سال رہیں اور چھ بچے ان سے پیدا ہوئے۔ عام روایات کے مطابق وفات کے وقت ان کی عمر ٦٥ سال تھی۔ جبکہ ان کی چھوٹی بچی فاطمہ صرف چودہ پندرہ برس کی تھیں۔ گویا فاطمہ رضی اللہ عنہا کی پیدائش کے وقت پچاس سال تھی۔ جو کہ سن یاس ہے۔ لہٰذا سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کی عمر نبی ﷺ سے شادی کے وقت ٢٨ یا ٣٠ سال اور وفات کے وقت ٥١/٥٣ سال تھی۔

اشکال کا جواب: بانجھ پن میں اولاد کا ملنا:

بریگیڈیئر صاحب نے چونکہ خود ہی تحریر کیا ہے کہ جمہور کے نزدیک رسول اللہ ﷺ سے شادی کے وقت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی عمر چالیس سال تھی۔ لہٰذا جمہور کے حوالے نقل کرنے کی ضرورت نہیں رہتی۔

یہاں تک سن یاس کا تعلق ہے کہ پچاس سال کی عمر میں عورت بانجھ ہو جاتی ہے۔ تو اس کے لیے وہ قرآن حکیم میں ابراہیم علیہ السلام کی بیوی سارہ کا قرآنی بیان پڑھ لیتے تو وہ شیطانی وسوسے کا شکار نہ ہوتے۔

سورۃ ہود میں جب ان کو فرشتے اسحاق علیہ السلام کے پیدا ہونے کی

بشارت دیتے ہیں تو وہ کہتی ہیں:

﴿ قَالَتْ يٰوَيْلَتٰٓى ءَاَلِدُ وَ اَنَا عَجُوْزٌ وَّ هٰذَا بَعْلِىْ شَيْخًا اِنَّ هٰذَا لَشَىْءٌ عَجِيْبٌ ○ قَالُوْٓا اَتَعْجَبِيْنَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ رَحْمَتُ اللّٰهِ وَ بَرَكٰتُهٗ عَلَيْكُمْ اَهْلَ الْبَيْتِ اِنَّهٗ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ ○ ﴾

[ھود: ۷۲،۷۳]

''ہائے افسوس! کیا میں بچہ جنوں گی۔ جبکہ میں بوڑھی ہوگئی اور یہ میرے خاوند بھی بوڑھے ہو چکے ہیں۔ یہ تو بڑی عجیب چیز ہوگی۔فرشتے کہتے ہیں۔اے اہل بیت! تم پر اللہ کی رحمت اور برکتیں ہوں۔کیا اللہ کے حکم میں تمہیں تعجب ہے۔ بے شک وہ بڑا ہی تعریف کیا گیا بزرگی والا ہے۔''

اسی بات کا دوبارہ ذکر سورۃ الذاریات میں بھی ہوا ہے۔

سورۃ مریم کے آغاز میں زکریا علیہ السلام کا واقعہ بیان ہوا ہے۔انہوں نے بڑھاپے میں اولاد کے حصول کے لیے اللہ سے دعا کی۔اللہ نے جب ان کو یحییٰ علیہ السلام کی بشارت دے دی تو انہوں نے عرض کیا:

﴿ قَالَ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِىْ غُلٰمٌ وَّ كَانَتِ امْرَاَتِىْ عَاقِرًا وَّ قَدْ بَلَغْتُ مِنَ الْكِبَرِ عِتِيًّا ○ قَالَ كَذٰلِكَ قَالَ رَبُّكَ هُوَ عَلَىَّ هَيِّنٌ وَّ قَدْ خَلَقْتُكَ مِنْ قَبْلُ وَ لَمْ تَكُ شَيْئًا ﴾

[مریم: ۸،۹]

''اے میرے رب! میرے ہاں بیٹا کیسے ہوگا جبکہ میری بیوی بانجھ ہوگئی اور میں انتہائی بڑھاپے میں پہنچ گیا ہوں۔اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ایسے ہی ہوگا۔تیرے ربّ کا فرمان ہے۔ ہمارے لیے ایسا کرنا بہت آسان ہے اور میں نے تمہیں پہلے پیدا کیا حالاں کہ تو کچھ بھی نہ تھا۔''

معمر مائیں:

بریگیڈیئر صاحب کو قرآنی حوالے شاید پسند نہ آئیں۔لہٰذا ان کے لیے چند حوالے ترقی یافتہ ملکوں کے پیش خدمت ہیں۔

۱۔ بوکاریسٹ+ رومانیہ۔۱۷ جنوری ۲۰۰۵ء۔۶۶ سالہ بچوں کے لیے کہانیاں لکھنے والی پروفیسر ایڈری اینا دنیا کی معمر ترین بچہ جننے والی عورت بن گئی۔

۲۔ ریڈنگ کیلیفورنیا۔۲۱ فروری ۲۰۰۶ء۔دنیا کی معمر ترین بچہ جننے والی عورتوں میں شامل ہونے والی ایک ۶۲ سالہ دادی نے کامیابی سے ایک بچے کو جنم دیا۔

۳۔ لنڈن: ۱۸ مئی ۲۰۰۹ء۔ ABC نیوز۔ ۶۶ سالہ الزبتھ ایڈینی برطانیہ کی معمر ترین بچہ جننے والی عورت ہوگی۔

اسی خبر کے ساتھ یہ بھی بتایا گیا۔۲۰۰۶ء میں سپین کی کارمیلا بوسارہ نے ۶۷ سال کی عمر میں بچہ جنا تھا۔

انڈیا کی اومکاری پنوار نے ۷۰ سال کی عمر میں اکٹھے دو بچوں کو جنم دیا۔

۴۔ صوفیہ: جمعرات ۳ مئی ۲۰۱۰ء، ڈان انٹرنیشنل۔ بلغاریا کی ایک ۶۲ سالہ عورت نے اکٹھے دو بچوں کو جنم دے کر ملک کی معمر ترین ماں بننے کا اعزاز حاصل کرلیا۔

مذکورہ حوالوں سے عیاں ہوجاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ جو اور جب چاہتا ہے کرتا ہے۔اس کے معاملے میں کوئی دخیل نہیں ہوسکتا۔انسان ہی کی کمزوری ہے کہ ایک غلط مفروضہ قائم کرتا ہے اور پھر غلطیوں پر غلطیاں کرتا چلا جاتا ہے۔ جب سن یاس کا سہارا بے کار ہوگیا تو اس پر اٹھائی گئی بحث فضول ولغو ہوگئی۔

کم عمر مائیں:

اللہ تعالیٰ نے اپنے ہر شئے پر قدرت رکھنے کا اعلان بار بار فرمایا۔ اس قدرت کاملہ کا ہی نمونہ ہے کہ جب اولاد دینے پر آئے تو نہ صرف بانجھ عورت کو عطا کر دیتا ہے بلکہ چھوٹی عمر والیوں کو بھی صاحب اولاد بنا دیتا ہے۔

۱۔ اردو اخبار کا بمع تصویر تراشا ہے۔ارجنٹائن کے دارالحکومت بیونس آئرز میں دس سالہ لڑکی ''مارتا'' نے ایک صحت مند بچے کو جنم دیا۔

[۹/اکتوبر ۱۹۷۱ء]

۲۔ روزنامہ جنگ ۲۳ جنوری ۱۹۸۸ء لاہور۔ (تصویر کے ساتھ) ۹ سالہ ٹریسا کی تین شادیاں ہو چکی ہیں۔ دو بچوں کی پیدائش کے بعد گھر

سے بھاگ گئی۔

جنگ فارن ڈیسک نے یہ خبر واشنگٹن کے حوالے سے لگائی۔

۳۔ ڈان: منگل: ۹ دسمبر ۱۹۹۷ء۔ ۸ سالہ لڑکی ماں بن گئی۔ یہ واقعہ ملتان سے ۱۳۰ کلومیٹر دور علی پور میں ہوا۔

۴۔ ۲۰ ستمبر ۲۰۰۷ء۔ روس میں کم ترین عمر میں ماں بننے والی لڑکی کی عمر گیارہ سال تھی۔

۵۔ لنڈن۔ یکم نومبر ۲۰۰۹ء۔ بلساریا میں ایک گیارہ سالہ سکول کی طالبہ نے اپنی شادی کے موقع پر بچے کو جنم دیا۔ نیوز آف دی ورلڈ۔ کورڈ رزا کے مطابق وہ دلہن کے لباس میں ہسپتال آئی۔ بچہ جننے کے بعد ایک رات اپنے بچے کے ساتھ گزارنے کے بعد اپنا شادی والا لباس پہن کر شادی کی تقریب کے لیے واپس پہنچ گئی۔ جبکہ ۱۳ سال میں ماں بننے کا وہاں عام رواج ہے۔

۶۔ ۳ فروری ۲۰۱۰ء چائنہ میں نو سالہ ماں بننے والی دنیا کی کم ترین عمر والی لڑکی ہوگئی۔

۷۔ تاریخ انسانی کا عجوبہ: ۱۴ مئی ۱۹۳۹ء مدرز ڈے والے دن پانچ سال آٹھ ماہ والی عمر کی لڑکی نے ۲۷۰۰ گرام وزن والے بچے کو جنم دیا۔ بچہ اور ماں دونوں صحیح سلامت ہسپتال سے چلے گئے۔ کمپیوٹر میں ڈاکٹر، ماں اور بچے کی تصویر دیکھی جاسکتی ہے۔ ماں کا نام لینا میدینا تھا اور واقعہ پیرو میں وقوع پذیر ہوا۔

مذکورہ حوالوں سے عیاں ہوجاتا ہے۔ اللہ جب چاہے عورت کو ماں بنا سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کیا ہی خوب فرمایا: ''عقل والو! عبرت حاصل کرو۔''

جب ثابت ہوگیا کہ سن یاس کی اللہ کے ہاں کوئی حقیقت نہیں تو بریگیڈیئر صاحب کے ''کہا گیا'' کے حوالے سے خدیجہ، فاطمہ، علی اور رسول اللہ ﷺ کی عمروں کے بارے میں بیان کردہ مفروضوں کی کوئی حیثیت نہیں رہتی۔ [جاری ہے]



مولانا محمد اکرم زاہد کی وفات

مولانا محمد اکرم زاہد (مدرس مدرسۃ الکبریٰ للبنات بیدیاں روڈ لاہور کینٹ) یکم اکتوبر بروز جمعۃ المبارک بوقت فجر دورانِ نماز وفات پا گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

مرحوم ایک صالح، کم گو اور باعمل عالم دین تھے۔ ان کی نماز جنازہ حافظ احمد اللہ حامد صاحب نے پڑھائی۔ بیشتر علماء وطلباء اور عزیز واقارب شریک جنازہ ہوئے۔ قارئین سے بھی دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔ پس ماندگان میں مرحوم نے بیوہ، تین بیٹے اور تین بیٹیاں سوگوار چھوڑی ہیں۔ [محمد ابوبکر عتیق، خطیب جامع مسجد اہل حدیث کوٹ قادر بخش (ننکانہ)]

سیرت شافع محشر ﷺ کانفرنس

مرکزی جمعیت اہل حدیث واہل حدیث یوتھ فورس سمندری کے زیر اہتمام ۴۷ ویں سالانہ عظیم الشان سیرت شافع محشر ﷺ کانفرنس زیر صدارت حضرت مولانا بہادر علی سیف، ۴ نومبر ۲۰۱۰ء بروز جمعرات بعد نماز عشاء فاروق اعظم گول چوک گھنٹہ گھر سمندری میں منعقد ہو رہی ہے۔ ان شاء اللہ

کنوینر کانفرنس مولانا عبدالرشید حجازی ہیں۔ کانفرنس سے مولانا منظور احمد، رانا محمد شفیق خان پسروری، قاری عبدالرحیم کلیم و دیگر علمائے کرام خطاب فرمائیں گے۔ [منجانب انتظامیہ]

تحقیق وتنقید

قربانی کے چار دن

حافظ محمد الیاس اثری

آج سے تقریباً پچیس سال قبل میں نے ایک رسالہ بنام: ''القول الأنیق فی توضیح أیّام التشریق'' لکھا تھا۔اس میں بحمد اللہ تعالیٰ ثابت کیا گیا تھا کہ قربانی چار دن تک جائز وصحیح ہے۔ وقت گزرتا گیا پھر ہفت روزہ اہل حدیث، جلد نمبر: ۳۸، مؤرخہ ۷ ربیع الثانی تا ۱۳ ۱۴۲۸ھ، مطابق ۲۷ اپریل تا ۳ مئی ۲۰۰۷ء میں ایک فتویٰ حافظ عبدالستار حماد ﷾ کا شائع ہوا۔ حافظ صاحب موصوف نے بھی ہمارے موقف کی تائید میں چار دن کے جواز کا فتویٰ دیا۔ حافظ صاحب موصوف کے پیش کردہ دلائل کا تذکرہ کر کے خرم ارشاد محمدی دولت نگر گجرات نے محترم جناب حافظ زبیر علی زئی مدیر ماہنامہ ''الحدیث'' [1] حضرو، کو لکھا کہ آپ ان دلائل کا تجزیہ فرما دیں کہ مفتی جماعت حافظ عبدالستار حماد کا موقف درست ہے؟ جواباً مدیر ماہنامہ ''الحدیث'' نے دلائل کا تجزیہ فرما کر مضمون لکھا کہ چار دن کے جواز میں پیش کردہ تمام احادیث ضعیف ہیں۔

راقم (محمد الیاس اثری) نے بھی چوں کہ اس موضوع پر ایک کاوش پیش کی تھی تو اس بنا پر کلیم حسین شاہ صاحب ﷾ مکتبہ ضیاء السنۃ اسلام آباد نے ''الحدیث'' میں شائع شدہ مضمون کی ایک فوٹو کاپی مجھے بھی ارسال فرمائی اور حکم دیا کہ اس موضوع پر قلم اٹھائیں اور واضح کریں کہ حافظ زبیر صاحب موصوف کا نقد صحیح ہے۔

یاد رہے کہ میں پہلے بھی [من انم کہ من دانم] ان احادیث کے بارے میں مناسب اور ضرورت کی حد تک تحقیق پیش کر چکا ہوں۔ اب پھر مزید سوچ وبچار کے بعد کچھ عرض کرنے کی جسارت کر رہا ہوں۔ اگر وہ تحقیق صحیح ہوئی تو یہ اللہ تعالیٰ کا فضل واحسان ہوگا اور اگر اس میں پھر کوئی ابہام رہ جائے تو اس کو میری کوتاہ علمی تصور کیا جائے۔

محترم جناب حافظ زبیر علی زئی صاحب کی تحریر پڑھنے سے معلوم ہوا کہ محترم حافظ صاحب اس حدیث (کل ایام التشریق ذبح) کو قبولیت کے کسی بھی درجہ میں ماننے کو تیار نہیں ہیں۔ جب کہ اس دور کے عظیم محقق علامہ ناصر الدین البانی ﷫ نے اس حدیث کو حسن لغیرہ تسلیم کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

والصواب عندی انه لا ینزل عن درجة الحسن بالشواهد التی قبله. [سلسلة الاحادیث الصحیحة، ج: ۵، ص: ۶۳۱]

قارئین کرام! یاد رکھنا کہ علم کے زور سے حسن لغیرہ حدیث کو قابل حجت اور لائق استدلال نہ سمجھنا اور تحقیق کے نام پر ہر چیز کو بہا کر لے جانا فتویٰ نویسی کی شان نہیں ہے۔ بلکہ مفتی حضرات کو چاہیے کہ اپنے پیش رو اہل علم سے استفادہ کرنے کی عادت اپنائیں۔ کیوں کہ انہوں نے یہ میدان پہلے ہی سر کر رکھے ہیں۔ ولا یسری ذلك المسری الا بدلا لته۔

یہ بات ملحوظ رہے کہ ہمارے بڑے بڑے مفتی ومشائخ حضرات اس حدیث کو حسن لغیرہ کے درجہ میں مان کر چار دن کے جواز کا فتویٰ دیتے ہیں۔

<u>قرائن وشواہد:</u>

میں یہاں چند ائمہ حدیث کی تائیدات اور پھر ان کی ترجیحات نقل

[1] شمارہ نمبر ۴۴، ذوالحجہ ۱۴۲۸ھ مطابق جنوری ۲۰۰۸ء

کروں گا۔ان شاءاللہ

① ......ابھی اوپر آپ نے مجتہد العصر علامہ البانی کی عبارت ملاحظہ فرمائی ہے کہ یہ حدیث شواہد کی بنا پر حسن لغیرہ ہے اور قابل استدلال اور لائق استناد ہے۔

② ...... قاضی شوکانی رحمہ اللہ نے اپنی بے نظیر کتاب ''نیل الاوطار'' میں اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے پانچ مذاہب کا ذکر کیا ہے اور فرمایا ہے کہ

ارجحها المذهب الاوّل للاحاديث المذكورة في الباب وهي يقوى بعضها بعضا .

[ج: ٥، ص: ١٤٢]

اس عبارت کا مقصد یہ ہے کہ اس باب میں جس قدر احادیث مروی ہیں ان سب کو ملا کر یہی مسلک ترجیح پاتا ہے کہ ایام قربانی چار دن ہیں۔

قاضی شوکانی رحمہ اللہ نے جن احادیث کی طرف اشارہ کیا ہے میں نے اپنے رسالہ ''القول الانیق'' میں ان پر پہلے ہی سیر حاصل بحث کر دی ہے۔اس کو ملاحظہ فرمالیا جائے۔

③ ...... جناب علی رضی اللہ عنہ کا ایک دوسرا قول (چار دن قربانی جائز ہے) بھی ہے جیسا کہ علامہ ابن قیم نے لکھا ہے اور پھر ان کے حوالہ سے قاضی صاحب نے بھی لکھا ہے:

ايام النحر يوم الاضحى وثلاثة ايام بعده .

[زاد المعاد، ج: ٢، ص: ٣١٩]

جناب علی رضی اللہ عنہ کے اس قول پر علامہ ابن قیم نے تنقید کی ہے اور نہ ہی قاضی شوکانی موصوف نے کوئی نقد کیا ہے۔

اعتراض:

اگر کوئی آدمی کہے کہ پھر اس بارے میں جناب علی کے دو قول ہوئے تو اس بات کو تسلیم کر لینے میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ کیوں کہ فقہائے حدیث خوب جانتے ہیں کہ تحقیقات ونظریات میں تبدیلی آنا امر ممکن ہے۔مگر کون سا قول راجح ہے یہ دلائل بتائیں گے کہ چار دن کا قول راجح ہے۔جیسا کہ شواہد بتا رہے ہیں۔

④ ...... جناب ابن عباس رضی اللہ عنہ کا بھی ایک قول (چار دن قربانی جائز ہے) موجود ہے۔[فتح القدير، ج: ١، ص: ٢٠٦]

⑤ ...... جناب عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کا ایک قول ہمارے موقف کا بڑا مضبوط مؤید ہے۔چناں چہ علامہ قرطبی لکھتے ہیں:

ان الايام المعدودات والايام المعلومات يجمعها اربعة ايام: يوم النحر وثلاثة ايام بعده . [تفسير قرطبى]

⑥ ...... جناب حسن بصری (تابعی) کا فتویٰ ہے کہ قربانی کے چار دن ہیں۔[السنن الكبرىٰ للبيهقى، ج: ٦، ص: ٢٩٧]اس کی سند صحیح ہے۔

⑦ ...... جناب عطاء رحمہ اللہ (بن ابی رباح) کا بھی یہی فتویٰ اور رائے ہے۔

يضحى الى آخر أيّام التشريق . [السنن الكبرىٰ]

حافظ زبیر صاحب نے بھی ''الحدیث'' میں ان اقوال کی سندوں کو صحیح اور حسن کہا ہے۔

⑧ ......جناب عمر بن عبدالعزیز سے بھی یہی منقول ہے:

الاضحى يوم النحر وثلاثة ايام بعده .

[السنن الكبرى، ج: ٩، ص: ٢٩٧]اس کی سند بھی حسن ہے۔

⑨ ......امام زہری مرحوم کا فتویٰ بھی ملاحظہ فرمالیں۔ان سے کسی نے مسئلہ پوچھا کہ ایک آدمی یوم النحر کو قربانی کرنا بھول گیا (اب وہ کیا کرے؟) تو انہوں نے جواباً فرمایا کہ

لا باس ان يضحى ايام التشريق .

[محلى، ج: ٧، ص: ٣٧٨]

⑩ ...... حدیث مذکور دو مختلف سندوں سے مروی ہے۔ ایک سند دوسری سند کی تائید کرتی ہے۔(كل منى منحر) اور (كل ايام التشريق ذبح) مکمل منی قربان گاہ ہے اور ایام تشریق قربانی کے دن ہیں۔تلك عشرة كاملة

یاد رہے کہ ابھی کئی قرائن میں نے قصداً ترک کر دیئے ہیں کہ جو ضرورت کے مطابق پیش کرنے کا میں حق محفوظ رکھتا ہوں۔

فائدہ: اس عنوان کے تحت حافظ صاحب موصوف نے تین دن کو راجح قرار دینے کی ایک دلیل یہ بھی دی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ابتداء میں تین دن سے زیادہ قربانی کا گوشت رکھنے سے منع فرمایا تھا۔ بعد میں یہ حکم منسوخ ہو گیا۔ یہ ممانعت اس کی دلیل ہے کہ ''قربانی تین دن ہے'' والا قول ہی راجح ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اوّلاً آپ نے یہی حکم جاری فرمایا تھا مگر پھر تین دن سے زائد گوشت کھانے اور آئندہ کے لیے ذخیرہ کرنے کی اجازت بھی دے دی تھی جیسا کہ امام ترمذی نے اپنی جامع میں اس کو نقل کیا ہے۔

میں بڑی احتیاط سے حافظ صاحب کا علمی مقام ملحوظ رکھتے ہوئے عرض کروں گا کہ آپ کی علمی شان کا یہ تقاضا نہیں ہے جو کہ آپ لکھ رہے ہیں۔ بلا معلوم روایت سے کون صاحب عالم استدلال کرتا ہے کہ آپ جیسے ذی علم و ذی وقار کی شان سے کوسوں دور ہے۔ آپ جیسے پڑھے لکھے محقق کو ایسے کمزور آشیانہ کا سہارا لینا قرین عقل و دانش نہیں ہے۔ ایسے کمزور آشیانہ پر کھڑی کی گئی عمارت فوراً ہی دھڑم سے نیچے آ گرے گی۔

مزید سنیے کہ

عظیم محدث حافظ ابن قیم اس کمزور استدلال کا پہلے ہی جواب دے چکے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

اما نهيه عن ادخار لحوم الاضاحى فوق ثلاث فلا يدل على ان ايام التشريق ثلاثة فقط لان الحديث دليل على نهى الذابح ان يدخر شيئاً فوق ثلاثة ايام من يوم ذبحه فلو اخر الذبح الى اليوم الثالث فجاز له الادخار فوق ثلاث ان اوّلها من يوم النحر ، قالوا وغير جائز ان يكون الذبح مشروعاً فى وقت يحرم فيه الاكل ، قالوا ثم نسخ تحريم الاكل فبقى وقت الذبح بحاله . [زاد المعاد]

جناب نبی کریم ﷺ کا تین دن سے زائد قربانیوں کے گوشت کو ذخیرہ کرنے سے منع کرنا اس امر کی دلیل نہیں ہے کہ قربانی کے تین دن ہیں۔ حافظ صاحب نے بطور دلیل فرمایا ہے کہ حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ جس دن قربانی کرنے والا قربانی کرے اس دن سے لے کر تین دن تک گوشت کا ذخیرہ کرنا اس کے لیے ممنوع ہے۔

آپ غور کریں کہ اگر قربانی کرنے والا تیسرے دن قربانی ذبح کرتا ہے اب وہ بھی تین دن تک ذخیرہ کرنے کا مجاز ہے۔

مگر یاد رکھنا یہ وقت تو گوشت کی ممانعت کا ہے کیوں کہ جن لوگوں نے تین دن تک قربانی کو محدود کیا ہے تو انہوں نے تین دن سے زائد ذخیرہ کی ممانعت یوم النحر سے شروع کی ہے۔ گویا ذبح کا پہلا دن یوم النحر ہے اور ان کا خیال ہے کہ جس وقت میں قربانی کا گوشت کھانا حرام ہے اس وقت میں ذبح کرنا جائز نہیں ہے۔ پھر انہوں نے کہا کہ گوشت کھانے کی حرمت منسوخ کر دی گئی یعنی تین دن سے زائد قربانی کا گوشت کھانے کا حکم منسوخ ہو گیا اور ذبح کا وقت اسی حالت میں باقی رہا۔ علامہ موصوف نے مزید فرمایا کہ

فيقال لهم ان النبى ﷺ لم ينه الاعن ادخار فوق ثلاث ، لم ينه عن التضحية بعد ثلاث فاين احدهما من الاخر . [زاد المعاد]

مزید ان کو جواب دیا جائے گا بلاشبہ آنحضرت ﷺ نے تین دن سے زائد صرف گوشت کو ذخیرہ کرنے سے منع کیا ہے تین دن کے بعد قربانی کرنے سے منع نہیں فرمایا۔ تو ان دونوں باتوں کا آپس میں کیا تعلق ہے؟ ودونه خرط القتاد .



تبصرۂ کتب

تبصرے کے لیے کتاب کے دو نسخوں کا آنا ضروری ہے

پندرہ روزہ "المنبر"،فیصل آباد

خصوصی اشاعت مئی جون ۲۰۱۰ء

تذکارِ پروفیسر عبدالجبار شاکر(۱۹۴۷ء......۲۰۰۹ء)

مدیر: ڈاکٹر زاہد اشرف

تبصرہ نگار: پروفیسر محمد بشیر متین فطرت

ممتاز اہل علم وادب، سیاسی، مذہبی اور معاشرتی حوالے سے نمایاں شخصیات بلاشبہ ملک وملت کا اثاثہ اور سرمایہ افتخار ہوا کرتی ہیں۔ عامۃ الناس کے علاوہ خواص بھی ان سے استفادہ کرتے ہیں۔ جب ان کا پیمانہ حیات لبریز ہوجاتا ہے تو ان کے معتقدین ان کی خدمات ومحاسن کا تذکرہ کرکے ان سے وابستہ یادیں تازہ کرتے رہتے ہیں۔

پروفیسر عبدالجبار شاکر مرحوم ایسے ہی نازشِ ملت افراد میں شمار ہوتے ہیں۔ ''المنبر''، فیصل آباد نے ڈاکٹر زاہد اشرف کی نگرانی میں پروفیسر شاکر مرحوم کے دوست احباب اور بعض دیگر اہل علم وقلم کی منتخب تحریروں سے ایک خوب صورت علمی گلدستہ ترتیب دیا ہے۔ جس میں پروفیسر موصوف کی تین نمائندہ تحریریں:

① ......سیرت نبویؐ کے امتیازات

② ......اقبال کا تصورِ قیادت

③ ......سینٹرل ایشیا کے دہانے پر، بھی بطور تبرک شامل ہیں۔

۳۶۸ صفحات پر مشتمل، المنبر کی یہ خصوصی اور خوب صورت اشاعت اس وقت ہمارے پیش نظر ہے۔ جس کا نیلگوں سرِ ورق، پروفیسر مرحوم کے قائم کردہ بیت الحکمت کی جھلک سے آراستہ ہے۔

لیکن کتاب دوست، کثیر المطالعہ، بیدار مغز خطیب، شائستہ کلام اور متحرک ومتوازن شخصیت ہونے کی بنا پر دیکھتے ہی دیکھتے ملکی سطح پر مقبول ومعروف ہوگئے۔ حیاتِ مستعار کے آخری دنوں میں وہ دعوہ اکیڈمی اسلام آباد کے ڈائریکٹر اور فیصل مسجد اسلام آباد کے خطیب تھے۔

کوئی مستقل تصنیف، اگرچہ ان سے یادگار نہیں، لیکن بیشتر علمی، ادبی، تاریخی اور اسلامی کتب پر تقریظوں اور دیباچوں کے علاوہ بعض منفرد تحریروں کی صورت میں ان کے رشحاتِ قلم، ان کے علم وفکر کی جولانیوں کے مظہر اور ان کے قائم کردہ علمی واشاعتی ادارے ان کی بہترین یادگار اور صدقہ جاریہ ہیں۔

ان کی کتاب دوستی، کتاب شناسی، وسعت مطالعہ، تقریر وخطابت، نوادرات سے ان کی دلچسپی، علم طب سے وابستگی اور ان کے اندازِ تفکر وتدبر وغیرہ گوناگوں عنوانات پر اہل قلم نے اپنے اپنے انداز میں قلم اُٹھایا اور اپنے قلبی تعلق کے دریچے وا کیے ہیں۔ ان مضامین کے مطالعے سے پروفیسر عبدالجبار شاکر مرحوم کی شخصیت ایک متحرک وروشن ہیولے کی طرح دکھائی دیتی ہے۔

''المنبر'' کی اس خصوصی اشاعت کے مطالعے سے یہ حقیقت بھی عیاں ہوتی ہے کہ علمی، ادبی، تعلیمی اور مذہبی حلقوں میں جو مقام پروفیسر موصوف کو حاصل ہوا، اس کے پس منظر میں ان کا مذاقِ علم، شائستگی فکر ونظر، ترجیحات کا تعین، اپنے اہداف سے لگن اور شبانہ روز مساعی کی تجلیات جلوہ گر ہیں۔ ان کے ذکر پیدائش سے سفر آخرت کے احوال کا یہ دل کشا تذکرہ نہ صرف علمی ادبی اور اقبالی حلقوں میں پسند کیا جائے گا بلکہ توقع ہے کہ پروفیسر مرحوم کے بارے میں شائقین علم وتحقیق کے لیے بھی چراغ راہ ثابت ہوگا۔ ''المنبر'' کی یہ خصوصی اشاعت، ادارہ المنبر کے

مثالی مسلمان

اِک مسلماں میں اگر ہو یہ صفت اور امتیاز
زندگانی میں رہے گا کامران و سرفراز

خندہ رو، شیریں سخن، جامع صفت ہو تیری ذات
مادر علمی کی ہر محفل کے ہو تم سوز و ساز

ابن آدم کے بنو تم ہم سخن اور ہم رکاب
پھر شریک غم رہو ایسی ہو خوئے دل نواز

دین و دنیا سب کرے تجھ کو عطا پروردگار
حج بیت اللہ سے بھی تجھ کو کرے گا سرفراز

تیری پیشانی میں نقش بندگی کی ہو دھنک
سجدۂ صد شکر میں برسیں اگر اشک نیاز

غزنویٔ وقت گر منکر کے توڑے سومنات
قافیہ بندی بنے شاہیں کی پھر زلف ایاز

[پروفیسر عبداللہ شاہین]

لیے بلاشبہ باعث تبریک ہے۔

تذکرہ مساجد اہل حدیث سیالکوٹ شہر

جمع وترتیب: مولانا عبدالحنان جانباز
ناشر: جامعہ رحمانیہ، ناصر روڈ سیالکوٹ
ضخامت: ۵۰۲صفحات
قیمت: ۲۵۰روپے
تبصرہ نگار: ارشادالرحمٰن

زیرنظر کتاب میں تاریخی شہر سیالکوٹ میں واقع اہل حدیث مساجد کے بارے میں معلومات پیش کی گئی ہیں۔ کتاب کو دو ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔

پہلا باب مساجد کے پتا جات، قیام وبنیاد، انتظام وانصرام اور تعمیر وتوسیع سے متعلق معلومات پر مشتمل ہے۔

دوسرے باب میں شہر بھر کے اہل حدیث علماء، خطباء، قراء اور حفاظِ کرام کے عمومی تعارف دیے گئے ہیں۔

مساجد سے متعلق معلومات میں مسجد کا سن تعمیر، سنگ بنیاد، افتتاحی نماز، افتتاحی امامت، افتتاحی خطبہ اور قیام مسجد کا تاریخی پس منظر انتظامیہ کے بیانات کی روشنی میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ معلومات کہیں مختصر اور کہیں مفصل ہیں۔

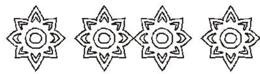
اسی طرح علماء وخطباء کے تذکروں میں بھی عمومی معلومات دی گئی ہیں۔ کہیں اجمال کہیں تفصیل۔ مرتب نے یہ تمام معلومات کیسٹ سے مدوّن کی ہیں۔ چوں کہ یہ کوئی علمی موضوع نہیں ہے۔ لہٰذا اس کو مناسب اور متوازن ضخامت میں پیش کیا جاتا تو بہت بہتر ہوتا۔

مساجد کا تذکرہ پڑھا جائے تو کہیں تشنگی کا احساس ہوتا ہے اور کہیں طوالت کا۔ بعض مقامات پر تو بے جا تفصیلات کا بھی سامنا ہوتا ہے۔ مساجد اور علماء وخطباء دونوں کے تذکروں کے لیے ایک جیسا اسلوب ہونا ضروری تھا۔ مثلاً کسی مسجد کی انتظامیہ بلکہ سابق انتظامیہ کا تذکرہ ہے اور کسی کا نہیں۔

مساجد میں خطبہ جمعہ کی مستقل ذمہ داری نبھانے والے علماء کا ذکر تو ضروری تھا لیکن ان مساجد کے عمومی پروگراموں اور جلسوں وغیرہ میں شرکت کرنے والے تمام علماء کی تفصیل بے جا ہے۔ بعض علماء وخطباء کے تذکروں میں ان کے آبائی علاقوں کے صرف بڑے شہر کا نام ذکر کیا گیا ہے۔ ان سے متعلق مزید کوئی بنیادی معلومات مہیا نہیں کی گئیں۔

کتاب کے شروع میں سیالکوٹ شہر کی تاریخی حیثیت پر ایک تحریر دی گئی ہے۔ بہتر ہوتا اگر سیالکوٹ کی تاریخی حیثیت کے ساتھ علمی تاریخ پر بھی جامعیت کے ساتھ روشنی ڈالی جاتی۔ مسجد سے متعلق تحریر میں بھی اسلامی معاشرے میں خصوصاً قرونِ اولیٰ کے اسلامی معاشروں میں مسجد کے ہمہ پہلو کردار پر جامع روشنی ڈالی جاتی تاکہ مسجد کے ہمہ گیر کردار کی اہمیت اجاگر ہوتی جو آج سمٹ کر رہ گئی ہے۔ آج مسجد کے اسی کردار کو بحال کرنے کی ضرورت ہے جس کا اوّلین نمونہ ونقش مسجد نبوی نے پیش کیا۔ یہی وہ مرکز اسلام تھا جہاں سے ہدایت کی روشنی نے پورے عالم کو منور کیا۔

کاش آج بھی مسجد نورِ ہدایت کی ایسی کرنیں بکھیرے، نفرت وتعصب کے شعلوں کا آتش کدہ نہ بنے۔ یہ امن وسکون کی جگہ ہو نہ کہ خوف وہراس کا قلعہ۔ اللہ کرے کہ مسجد سے متعلقہ افراد اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کر کے انہیں کما حقہ ادا کرنے کی سعی کریں۔



اعتذار

شمارہ نمبر ۴۲ جلد ۶۲ کے صفحہ نمبر ۳۰ پر ''غازی نذیر احمد بن مولوی محمد شہید (شہید پاکستان)'' مدیر ہفت روزہ اہل حدیث لاہور، کے حقیقی بھائی نہیں ہیں۔ یہ محمد بشیر صاحب انہی کے محلّہ کے فرد ہیں۔ اتفاقاً گلی اور شہر بھی ایک ہے اور برادری بھی ایک ہی ہے۔ قارئین وجماعتی احباب نوٹ فرمالیں۔ [ادارہ]